ماہنامہ

نفاذ اردو

اکتوبر 2023

افسانہ نمبر

WWW.TNUPAK.COM

03495059760

ماہنامہ نفاذ اردو

خصوصی اشاعت ۔ ۔ افسانہ نمبر

زیر نگرانی : فرخندہ شمیم

مدیر اعلی : عطاء الرحمن چوہان

مدیر : عالیہ بٹ

مدیر منتظم : کائنات رشید

مدیران معاون

محمد اسلم نشتر، ماہ جبیں قیصر
تسنیم کوثر، ثروت اقبال

اس شمارے میں

مقابلہ افسانہ نگاری میں منتخب افسانے

- فرمان الہی
- اداریہ
- فرحی نعیم
- روبینہ یاسمین
- علی معراج عباسی
- مریم شہزاد
- محمد آصف اسحاق
- سحل راجہ
- طیبہ رفیق
- بنت احمد
- طوبیٰ نور خانم
- علینہ شاہ
- انیلہ شہباز
- مہرین حسین
- عروۃ الھدیٰ ملک
- زینب نثار چھٹی
- خنساء سعید
- آمینہ یونس
- عمران خان
- علی رضا
- نوید انجم
- علیزے خان

تحریک نفاذ اردو پاکستان

www.tnupak.com, 03495059760

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے میں فیصلہ کرتے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

(الاحزاب:36)

یہ محض انفرادی معاملات تک محدود نہیں بلکہ مومنین کے جملہ امور کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے۔ جس کا تقاضا ہے کہ مومن کے انفرادی اور اجتماعی (ریاستی) معاملات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق انجام پائیں۔ اس لیے کلمہ پڑھنے کے بعد بندہ صرف مسلمان ہوتا ہے، وہ نہ جمہوریت پسند ہے، نہ سیکولر ہے اور نہ کمیونسٹ بلکہ صرف مسلمان یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا مطیع اور فرمان بردار۔ جو لوگ اس بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہیں، انہیں ان آیات کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے۔

اداریہ گونگا پاکستان

اردو میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن اردو پر بہت کم لکھا گیا اور نفاذِ اردو پہ تو سرے سے کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ ایک قوم جس سے اس کی پہچان چھین لی گئی ہو اور اس زبان کے قلم کار بھی اسے بھول جائیں، اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا؟ 8 ستمبر 2015 کو عدالت عظمیٰ پاکستان نے نفاذ قومی زبان کا تاریخ ساز فیصلہ دیا تو اردو پوری قوم کی توجہ کا مرکز بنی۔ ہم نے جب دیکھا کہ حکمرانوں کی نیتیں درست نہیں اور وہ دستور کی شق 251 کی طرح عدالت عظمیٰ کے فیصلوں کو بھی خاطر میں نہیں لائیں گے تو ہم نے جنوری 2016 میں تحریک نفاذ اردو پاکستان کی بنیاد ڈالی کہ عوالناس کو متوجہ کیا جائے۔ تب "نفاذ اردو" بارے علمی، ادبی اور تیکنکی مواد کی تلاش شروع کی تو پتہ چلا کہ اشرافیہ کی طرح اردو کے قلم کاروں نے بھی "اردو" کو بھلا دیا ہے۔ اسے ذریعہ اظہار تو بناتے ہیں لیکن اس کے تحفظ اور نفاذ کے بارے میں لکھنے کی توفیق کسی کو بھی نہیں ہوئی۔

تحریک نفاذ اردو پاکستان نے 2022 میں طلبہ و طالبات کے درمیان مقابلہ مضمون نویسی "نفاذِ قومی زبان کی اہمیت و ضرورت" اور" قائداعظم کا تصور قومی زبان" کے عنوان سے منعقد کیا، جس میں سینکڑوں طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ اسی طرح جولائی 2023 میں پھر مقابلہ مضمون نویسی منعقد ہوا اور اگست 2023 میں مقابلہ افسانہ نگاری بعنوان " گونگا پاکستان "کا اعلان کیا گیا۔ جس میں نوخیز لکھاریوں نے قلم اٹھایا اور اردو کی تاریخ میں پہلی خود اردو پر افسانہ نگاری شروع ہوئی۔ نوجوان لکھاری خواتین اور حضرات نے عرق ریزی سے موضوع پر خاکے تیار کیے اور انہیں افسانوی ڈھانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔

میں ملک کی مایہ ناز افسانہ نگار اور ادیبہ محترمہ فرخندہ شمیم اور ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر جوزف لال کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان افسانوں کی جانچ پڑتال کی اور نوجوان قلم قاروں کے افسانوں کی درجہ بندی کی۔ ادارہ تمام افسانہ نگاروں کا بھی ممنون ہے جنھوں نے اس موضوع پر پہلی بار قلم اٹھا کر اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

عطاء الرحمن چوہان مدیر اعلیٰ

19۔ ستمبر 2023

"گونگا پاکستان

از: فرحی نعیم

گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے مناظر، درخت، میدان، اور پھر چھوٹے، بڑے گھر، بازار، کتنا اچھا اور مختلف بھی لگ رہا تھا ۔ آج شہر کا موسم بھی خلاف توقع دلفریب تھا۔ ٹھنڈی ہوا مزاج پر بھی خوشگوار اثر ڈال رہی تھی۔ نادرا نم مگر مسکراتی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔

پیچھے بیٹھا اسد ویڈیو بنا رہا تھا۔ اور عینا بڑی دلچسپی سے دائیں بائیں گردن گھما رہی تھی۔

"ابھی کتنا ڈسٹنس ہے۔؟" چھوٹی ردا نے نیند سے بوجھل لہجے میں انگریزی میں سوال کیا۔ جس پر نادرا نے اپنے بھائی ایاز کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ٹین منٹس بے بی۔۔۔"

ایاز نے پیار سے کہا۔ اور ردا نے اکتا کر پھر آنکھیں بند کر لیں ۔ اسے باہر کے نظاروں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ نیند سب پر حاوی تھی۔

"ردا، تم یہ دیکھو نا، یہاں کیسے کیسے گھر ہیں اور یہ ان لوگوں کا ڈریس۔۔۔۔" اسد نے بہن کو متوجہ کیا۔ لیکن وہ آنکھیں بند کیے رہی۔

پھر جلد ہی گاڑی گھر کے دروازے کے پاس رک گئی تھی۔ کھٹ کھٹ دروازے کھلے اور سب آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم۔۔۔۔نانی اماں" بچے نانی سے مل رہے تھے اور نانی بھی بچوں سے لپٹ رہی تھیں، آخر پورے پانچ برس بعد بیٹی دیار غیر سے آئی تھی۔

××××××××××

"نانی جان آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔"

"اور بڑا بھی۔۔۔"

"اور گارڈن بھی ہے، ہمارا تو بس ایک چھوٹا فلیٹ ہے۔۔" بچے اگلے دن نانی، ماموں، مامی کے پاس بیٹھے اپنے تاثرات، انگریزی میں بیان کر رہے تھے۔

" آپ لوگ تھکن اتارو، پھر ہم سب انجوائے کریں گے، روز تفریح۔۔"عامر جوش سے گویا ہوا۔

"ہاں میں تم کو اپنے ایک فرینڈ سے ملوائوں گا، ان کا گھر تو ہم سے بھی بڑا ہے۔" ایاز کے بچے انگریزی میں بات کر رہے تھے۔

"گرینی! میں آپ کی ڈراسے وہ البم لاؤں، اسد اور عینا کو دکھاؤں گی" کنزی نے کسی پرانی البم کا پوچھا، نانی اماں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"بچوں، تم لوگ اردو میں بات کیوں نہیں کر رہے ؟، میں کل سے، یہی دیکھ اور سن رہی ہوں کہ تم سب، ہم سے انگریزی میں ہی گفتگو کر رہے ہو۔" نادرا متعجب تھی۔

"نادو انٹی، آپ وہاں انگلش ہی تو بولتیں۔۔۔۔۔؟۔" عفرا نے کہا۔

"ہاں تو وہاں بولتے ہیں نا، کیونکہ انگلش وہاں کی زبان ہے۔، لیکن ہماری تمھاری زبان تو اردو ہے، اور یہ تینوں۔۔" نادرا نے اپنے بچوں کی طرف اشارہ کیا" میں اور ان کے بابا، بچوں سے گھر میں اردو میں ہی بات کرتے ہیں، لہذا انھیں بہت اچھے سے اردو آتی ہے۔"

"اچھا انٹی۔۔" غزل نے حیرانی سے بھنویں اچکائیں۔ سب بچوں میں اس کی اردو سب سے کمزور تھی۔ "ویسے مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ آپ زبان کیوں کہہ رہی ہیں؟ زبان یعنی ٹنگ تو ہم سب کی ایک ہے۔؟؟" وہ متحیر تھی۔

"بے وقوف، وہ لینگوئج کی بات کر رہی ہیں، ٹنگ نہیں۔" عامر نے جھلا کر انگریزی میں کہا۔

"اوہ۔۔!!" اس کی آنکھیں پھیلیں۔

"ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ تم بچے مجھے آنٹی کیوں کہتے ہو۔؟، فون پر بھی میں تمھیں ٹوکتی ہوں۔۔!"

"تو کیا انکل کہیں۔؟" بھانجے ارسلان نے ایک قہقہہ لگایا جیسے سن کر سب ہی ہنس پڑے۔

"پھر افتخار انکل ناناراض ہو جائیں۔"؟ یہ کہنے والی کنزی تھی۔

"ارے بھئی سیدھا سیدھا پھوپی اور خالہ کہو، جو میرا تمہارا رشتہ ہے۔"

"اوہ!! کیا کہہ رہی ہیں۔؟" غزل نے پوری آنکھیں کھولیں۔

"باہر والے تو چند ماہ رہ کر ماڈرن ہو جاتے ہیں اور آپ ہیں کے اتنے سال کے بعد بھی۔۔۔!" عفرا ہنسی۔

"اچھا نادرا اور بچوں کھانے میں بتاؤ، آج کیا پکائیں۔"؟ بڑی بھابھی نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ممی، شاشلک بنالیں اور۔۔۔۔

"جب تک ہمارے خاص مہمان ہیں تو کھانا ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق بنے گا۔" بھابھی مسکرائیں۔

"تو شاشلک، منچورین تو سب کا پسندیدہ ہوتا ہے۔۔" کنزی نے معصومیت سے کہا۔

"ہوں۔۔۔ لیکن۔۔!"

"فرزانہ جو بچے کہہ رہے ہیں، وہی بنالو،" نادرانے بھتیجی کی حمایت کی۔

"نہیں باجی آپ بتائیں۔" چھوٹی بھابھی نے بھی جٹھانی کی تائید کی۔

"تو پھر ہمیں تو پلاؤ، بریانی پسند ہے۔"

"ہاں اور وہ شاہی ٹکڑے۔۔۔" اسد نے ماں کی بات بڑھائی۔

"ہائیں! کس کے ٹکڑے۔؟" غزل پریشان ہوئی۔

"توبہ۔ نادوانٹی، میرا مطلب خالہ، آپ تو اب تک دیسی ہی ہیں اور آپ نے تو بچوں کو بھی اپنے جیسا بنا دیا۔" عفرا نے غزل کی بات کو نظر انداز کر کے ناک چڑھائی۔

"توبرا کیا؟" نادرہ نے سوالیہ نظریں سب پر ڈالیں۔ "ہاں میں یہ پوچھ رہی تھی کہ تم بچے اردو میں بات کیوں نہیں کرتے ۔؟"

"اب اردو میں یہاں کون بولتا ہے ؟ ہمارے دوست، کلاس فیلو، سب انگلش میں ہی بات کرتے ہیں، اسکول، کالج میں بھی ہمیں اسی زبان میں بات کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، تو پھر ہم انگلش میں ہی گفتگو کرتے ہیں۔" عامر نے کندھے اچکائے۔

"گھر میں بھی ہمارے پیرنٹس، ہمارے انگلش میں بات کرنے پر خوش ہوتے ہیں"۔ ارسلان نے سر ہلایا

"جی ہاں، پھر آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں؟" اب کنزی نے پھوپی کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

"سچ کہتے ہو، یہاں بڑے ہی پہلے دباؤ ڈالتے ہیں کہ، انگریزی میں بات کی جائے، نہ جانے ہم کیا چاہتے ہیں، اور یہ کہ تمھاری نسل نے جب سے موبائل پر رومن لکھنی شروع کی ہے، جب سے تو سمجھو اپنی زبان کا اور زوال آگیا۔

"ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو، اب نہ یہ اردو کے رہے اور نہ انگریزی کے۔" ایاز نے پردیسن بہن کی تائید کی اور باقی سب بڑے بھی سوچ میں پڑ گئے۔

××××××××××××

نادرا، چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اپنے والدین، دو بڑے بھائی، ایاز اور فیاض اور ایک بڑی بہن اسماء، کے ساتھ ایک آسودہ زندگی گزار رہی تھی، بڑے بھائی، بہن کے بعد جب اس کی شادی کا نمبر آیا تو والدین کو اس کے لیے جو رشتہ پسند آیا وہ لڑکا اور اس کے گھر والے سب کئی برسوں سے باہر رہتے تھے۔ والدین کے لیے یہ رشتہ ہر طرح سے موزوں تھا، لیکن نادرا، اپنی ہم عمر لڑکیوں کے بر خلاف غیر ملک میں رہنے سے گھبراتی تھی وہ والدین، بہن، بھائی، اور

سہیلیوں کو اور سب سے بڑھ کر اس ملک کو چھوڑ کر نہ جانا چاہتی تھی، لیکن شاید قسمت میں یہی لکھا تھا, اور وہ پندرہ سال قبل دور دیس سدھاری۔ شروع میں دو، سال میں چکر لگ جاتا ، لیکن بچوں کی مصروفیات میں یہ وقفہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا، اس مرتبہ تو وہ پورے پانچ سال بعد آئی تھی۔ اور آکر سخت متعجب تھی۔

××××××××××

"اف اماں، مجھے یقین نہیں آرہا، میں اپنے ملک میں ہوں؟۔"

"بس بیٹی کیا کریں، پچھلے چند سالوں میں تو یہاں بہت تبدیلیاں آگئیں۔"

"آپ اسے تبدیلی کہہ رہی ہیں، انقلاب کہیں, انقلاب،! یہ ہماری بچیاں لگ رہی تھیں؟ نہ زبان اپنی نہ لباس اپنا، نہ پکوان اپنے!!"نادرا سر تھامے بیٹھی تھی۔

"ہاں بیٹی۔" اماں شرمندہ تھیں۔

"کیا کسی کو بھی برا نہیں محسوس ہوتا"؟

"ہوتا کیوں نہیں، بس خاموش رہتے ہیں"۔ اماں دھیرے سے پشیمانی سے گویا ہوئیں۔ جیسے خود کو ملامت کر رہی ہوں۔

نادرا کو یہاں آئے ایک ہفتہ سے زائد ہو چکا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے گھر اور گھر سے باہر لوگوں کے رویوں اور بول چال کا جائزہ لے رہی تھی، اور جیسے جیسے اس کا مشاہدہ ہو رہا تھا ویسے ویسے تاسف میں بھی اضافہ ہو تا جارہا تھا۔ آج بھی وہ خاندان کی ایک شادی میں گھر والوں کے ساتھ شرکت کر کے آئی تھی اور محفل کے انداز و اطوار دیکھ کر اس کا تو منہ کھلا رہ گیا تھا، یہ تو اسے علم تھا کہ یہاں بدلاؤ آچکا ہے، لیکن اتنی تبدیلی کے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ایک پاکستانی معاشرے کی تقریب میں شریک ہوئی ہے یا کسی مغربی ملک کی؟

مخلوط محفل، رقص، موسیقی، نامناسب لباس اور

اور۔۔۔ زبان۔۔! وہی، اردو سے شرمسار، انگریزی سے مرعوب۔۔۔

" اففف!!" نادرا نے سر تھام لیا تھا، اس کا دل تو کر رہا تھا کہ فوراً گھر واپس چلی جائے، لیکن بیٹھنے پر مجبور تھی کہ اس کی ماں، بہن، بھائی اور بھابیاں بچے سب بڑے خوش اور مطمئن انداز میں رشتے داروں سے ملاقات کر رہے تھے۔ واپسی میں وہ بہت افسردہ تھی۔ اور گھر آکر تو ماں کے سامنے تقریباً پھٹ ہی گئی۔

"جس ملک کی اپنی پہچان ہو, جس کا لباس و زبان اس کی پہچان ہو، جس کے رسم و رواج اپنی علیحدہ ایک شناخت رکھتے ہوں، وہاں، یہ سب۔۔۔؟؟ مستعار لیے ہوئے رواج؟" وہ بچپن سے ان معاملات میں حساس تھی۔

"چھوڑو بیٹا تم کیوں دکھی ہو رہی ہو؟" اماں اس کے کرب کو محسوس کر سکتی تھیں, لیکن پھر بھی اسے ٹالنے کی کوشش کی۔۔ وہ ماں کی بات سن کر انہیں ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔ اور پھر کتنی دیر تک وہ بستر پر لیٹی جاگتی رہی" اماں کہہ رہی ہیں میں کیوں دکھی ہوں، واقعی میں کیوں دکھی ہوں؟, کیا اماں سمجھتی ہیں کہ میں وہاں جا کر بدل گئی یا ان۔ کے ماحول میں ڈھل گئی، نہیں اماں میں صرف اتنی ہی ڈھلی جتنا اس کی ضرورت تھی، ورنہ میں وہی ہوں اپنی جڑوں سے وابستہ، یہ تو قسمت مجھے وہاں لے گئی، لیکن مٹی کی خوشبو تو آج بھی میری روح میں بسی ہے، مجھے تو اپنے وطن کی ہر شے سے محبت ہے، اور میری زبان تو ہے ہی میری کمزوری۔۔۔!!" وہ سوچوں میں گم اور اپنے سوال کا جواب تاروں بھرے آسمان کو تکتی سوچتی رہی۔ تلاش کرتی رہی۔ نیند بھی تو آج شاید اسی سبب روٹھی ہوئی تھی۔

××××××××××

"یہ تو ہم دیار غیر میں رہنے والوں سے کوئی پوچھے، اپنی ثقافت کی، اپنی زبان کی حیثیت، اس کی اہمیت، جو یہاں کے لوگوں نے بے مول کر دی، میٹھی زبان ہوتے ہوئے بھی اسے گونگا بنا دیا۔" آج پھر سب جمع تھے۔ بات آج کی نسل کی پسند، ناپسند سے شروع ہوتی، رومن اردو لکھنے پر پہنچ گئی تھی ۔اور نادرا پھر دل کا غبار نکال رہی تھی۔

"گونگا۔۔!!؟" سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہم۔ سمجھے نہیں۔؟" ارسلان حیران تھا۔

"آپ بچے سمجھ بھی نہیں سکتے، یہ تو ہم ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ تو ہر دنیاوی نعمتوں سے بہرہ ور ہو کر بھی، محروم ہو، زبان کے معاملے میں ہی گونگے نہیں بلکہ۔۔۔" وہ ٹھہری پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ گویا ہوئی" آپ تو ہر شعبے میں گونگے ہو رہے ہو، اور جہاں نہیں ہو وہاں کر دیا جا رہا ہے۔۔ مغربی تہذیب کے دلدادہ۔۔"

"ایسے تو نہ کہیں پھپو۔۔"

"تو بیٹا تم ہی بتاؤ، کیا تمھارے اسکول، کالج غیر ملکی نظام کے تحت نہیں۔"۔؟ نادرا نے سوال اٹھایا۔" دفتری زبان انگریزی ءتم سب کے لباس مغربی، بازاروں میں کھانے کے .مرکز چائنیز، تھائی، انگریزی، یا دوسرے غیر ملکی۔۔، ہر دکان کے باہر، سڑکوں پر بڑے بڑے اشتہاری بورڈز لیکن انگریزی زبان میں لکھے ہوئے، کیا تم سب غلام ہو، جو زبان کے ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی شعار بھی بھول بیٹھے۔۔؟

"سوری پھپو۔" لہجے میں شرمندگی تھی۔

یہ دیکھو، معذرت بھی انہی کی زبان میں۔۔۔"

"تو ہم آخر کیا کریں۔۔؟" عفرا نے مدد طلب کی۔

"بارش کا پہلا قطرہ بن جاؤ۔" نادرا مسکرائی۔

"خطرہ۔۔!!؟" غزل کی آنکھیں پھیلیں۔ "واٹ آر۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ؟۔ ہم کیوں ڈینجر ہو جائیں۔"؟ اور اس پر کسی نے آنکھیں پھاڑی تھیں، تو کوئی منہ چھپا کر ہنسنے لگا تھا۔

"یہ سچ مچ رونے کا مقام ہے۔" نادرا نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"کیوں آنٹ۔۔ نہیں پھپو۔۔" جلدی سے تصحیح کی۔

"ارے تمھاری پھپو، ڈینجر کی نہیں ڈراپ کی بات کر رہی ہیں، قطرہ۔۔۔ بارش کا پانی۔" ارسلان نے دانت کچکچائے۔

"اوہ، اچھا۔" اس نے تیزی سے سر ہلایا۔

"اگلے ہفتے میں واپس جا رہی ہوں، نہ جانے پھر کب آنا ہو، تم لوگ مجھے کوئی تو امید دلاؤ کہ اپنی زبان کو بچانے کے لیے، اس کی حفاظت کے لیے کچھ اقدامات کرو گے۔ ہماری امیدیں تمھاری نسل سے ہی وابستہ ہیں۔" نادرا نے پر امید نگاہوں سے بھانجے، بھانجی، بھتیجوں اور بھتیجیوں کو دیکھا۔

"بس پھپو میں تو اب اپنی اردو لینگو یج ٹھیک کروں گی۔ پرامس۔۔" سب سے پہلے غزل نے اردو، انگریزی میں وعدہ کیا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہ کام کروں گا۔"

"ہم بھی کوشش کریں گے۔" سب بچوں نے نادرا کے ہاتھ میں آس کا جگنو تھمایا تھا۔

"چلو، یہ بھی ٹھیک ہے۔ کم از کم اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی کرن تو چمکی۔ اگر کوشش جاری رہی تو خورشید بھی چمکے گا۔ #

قومی زبان، قوم کی پہچان ہے۔ جب تک قوم کو اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے اور امور مملکت چلانے کا حق نہیں ملتا، قوم نہ اپنے پاوں پر کھڑی ہو سکتی ہے اور نہ اپنی پہچان بنا سکتی ہے۔ قوم کی زبان اور لباس اس کی پہچان ہوتی ہے۔ جس قوم سے اس کی زبان اور لباس چھین لیا جائے، وہ جلد اپنا وجود کھو دیتی ہے۔

عطاء الرحمن چوہان، صدر تحریک نفاذِ اردو پاکستان

افسانہ تقدیر

روبینہ یاسمین ملتان

ہر امیر آبادی کے ساتھ ہمیشہ ایک کچی آبادی ضرور ہوا کرتی ہے کیونکہ اس کچی آبادی کے افراد ان امیر لوگوں کا کام کرتے ہیں اور اس طرح روزی روٹی کا انتظام ہو جاتا ہے ان کی عورتیں اور بچے ان کا بچا کچا کھانا کھا کر زندگی کے دن گزر رہے ہوتے ہیں اس کے علاوہ تن ڈھانپنے کے لیے ان کے پرانے کپڑے پہنتے ہیں اور ان کی پرانی استعمال شدہ گھر کی چیزیں ان کو دیتے ہیں۔ میرا گھر بھی ایسی ہی ایک کچی آبادی کے قریب تھا میں اکثر اپنے گھر کی اوپر والی منزل میں چلا جاتا تاکہ آرام سے دفتر کا کام کر سکوں وہاں سے علی کا گھر واضح نظر آتا تھا اس گھر کا ایک کمرہ تھا ایک برآمدہ اور اس میں ایک طرف چولہا اور چند برتن رکھے ہوئے تھے یہ ان کا باورچی خانہ تھا گھر چھوٹا تھا لیکن صاف ستھرا تھا علی اور زینب دو بہن بھائی تھے اس کے علاوہ اس گھر میں اس کے دادجان اور امی ابو رہتے تھے علی کے دادا کی ورک شاپ تھی لیکن کوئی خاص آمدنی نہ تھی۔

ان کے کپڑے اور جوتے پھٹے پرانے تھے علی کے والد کے پاس ایک سائیکل تھی اور اس پر کپڑے کا تھیلا لٹکا رہتا تھا ایک دن بچوں باپ گھر آیا تھیلا کسی چیز سے بھرا ہوا تھا۔ بچے اور ان کی ماں نے تھیلا لیا اور کمرے میں چلے گئے کافی دیر تک کمرے سے نہ نکلے اب روزانہ کا معمول بن چکا تھا ایک روز بچوں کے باپ کو دیر ہو گئی۔ ماں اور بچے بڑے بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ اچانک دروازہ کھلا اور باپ تھیلا اور سائیکل لے کر اندر داخل ہوا سب خوش تھے سب تھیلا لے کر کمرے میں چلے گئے۔ بچوں کا دادا ہر وقت ورک شاپ میں رہتا اور اکثر رات کو سو بھی وہیں جاتا تھا۔ آج موسم بھی اچھا تھا لیکن ان کی ماں برآمدے کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھے۔ کچھ بیمار سی لگ رہی تھی روزانہ کی طرح باپ بھرا ہوا تھیلا لایا علی برآمدنے میں رکھے ہوئے برتنوں میں سے ایک آٹا گوندھے والی پرات اٹھا کر لے آیا اور تھیلے کی چیز اس میں انڈیل دی وہ سب قطار میں کھڑے تھے اور مجھے کچھ اچھے طریقے سے چیز نظر نہیں آ رہی تھی وہ سب اس چیز کے سامنے کھڑے تھے جب سب نے آہستہ آہستہ چیز اٹھائی اور وہاں سے ہٹ گئے تو کیا میں دیکھتا ہوں یہ تو تربوزے کے چھلکے تھے جس پر ابھی لال لال گودا باقی تھا (جسے بچوں کا والد) ریڑی والے سے لے کر آیا تھا اس کے اوپر سے لال لال گودا بیچنے کے لیے کاٹ لیا باقی چھلکے ساتھ تھیلے میں ڈالا کر دے دیا۔

علی کے دادا کی ورک شاپ تھی میرے پاس بھی یاماہا موٹر سائیکل ہے میں اکثر اس کو مرمت کروانے اس ورک شاپ جاتا تھا علی کے دادا اور علی دوسرا لڑکا حسن سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی وقتاً فوقتاً میں ان کی مدد بھی کرتا۔ ایک میرا دوست جو جاپان گیا ہوا واپس آیا اور مجھے سے بھی ملنے آیا اس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ میں ایک جاپانی وفد کے ساتھ آیا ہوا ہوں کیونکہ پاکستان میں یاماہا کے موٹر سائیکل بڑی تعداد میں لوگوں کے پاس ہیں اور یقیناً یہاں لوگ اس کو مرمت بھی کرواتے ہوں گے اور ورک شاپز بھی ہوں گی لیکن یہاں کوئی خاص ورک شاپ مجھے نہیں نظر آئی میں اس کو لے کر علی کے پاس چلا گیا جب میں یہاں آیا تھا علی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی مجھے اب یہاں رہتے پانچ سال ہو گئے ہیں علی ایک تجربہ کار نوجوان بن چکا تھا۔

شارق علی یہ میرا دوست قاسم ہے۔

علی: اسلام و علیکم قاسم: و علیکم اسلام

علی: صاحب آپ کی بھی موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہے۔

قاسم: نہیں میں شارق کے ساتھ آیا ہوں تم سے ملنے شارق بتا رہا تھا کہ آپ یاماہا موٹر سائیکل کی مرمت اچھے طریقے سے کرتے اور اس موٹر سائیکل کی رگ رگ سے واقف ہیں اس لیے میں یہاں آیا ہوں۔ میرے ساتھ ایک جاپانی وفد بھی آیا ہوا ہے۔ میں وہاں یاماہا موٹر سائیکل کے کارخانے میں کام کرتا ہوں کیونکہ میں پاکستانی اور وفد نے پاکستان کا دورہ کرنا تھا اس لیے میرا انتخاب کیا گیا اور میں ان کے ساتھ آیا ہوں مجھے آپ جیسے ہنر مند کی تلاش تھی جو یاماہا موٹر سائیکل میں مہارت رکھتا ہوں قاسم نے علی سے چند سوالات کیے جس سے اس مہارت کا اندازہ لگایا جا سکے علی واقعی غیر معمولی طور پر ذہین ہے علی نے کام ساتھ تعلیم جاری رکھی اور میٹرک کر گیا اس نے اپنی بہن زینب کو بھی تعلیم دلوائی اور وہ بھی میٹرک کر گئی۔ علی شارق اور قاسم کو اپنے گھر کے لیے گیا۔ زینب علی سے ایک سال چھوٹی تھی وہ دونوں بہن بھائی بہت ذہین اور خوبصورت تھے۔ زینب سب کے لیے چائے بنا کر لائی اور علی بھاگ کر بسکٹ لے آیا۔ قاسم نے زینب کو دیکھا تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور ایک دوسرے کو پسند کر لیا ۔شارق اور قاسم تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے اگلے دن آنے کا وعدہ کیا دوسرے دن وفد بھی آئے گا۔ شارق نے علی کو کچھ پیسے دیئے کہ وہ وفد کے لیے کھانا تیار کروالے اگلے دن وفد آیا انہوں نے علی اور اس کے دادا سے مل کر خوش ہوئے سارے علاقے میں صرف ایک شخص مہار ملا ہے۔ وفد آیا باتیں ہوئیں انہیں علی کو اپنے ملک لے جانے کے لیے دادا اور اس کے باپ سے اجازت مانگی میں نے انہیں سمجھایا کہ یہ میرا دوست اور یہ جاپانی کمپنی میں کام کرتا ہے اور علی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ پہلے وہ بہت گھبرائے لیکن کافی عرصہ اس کے پاس آنے جانے کی وجہ سے مجھے اس پر اعتماد

کیا اور جانے کی اجازت دے دی۔ علی کی تنخواہ علی اپنے والدین کے اکاؤنٹ میں بھیجتا رہا جو وہ جانے سے پہلے والد کے نام کھلوا گیا تھا۔ دو سال میں اتنی رقم جمع ہو گئی تھی اسے اپنے دادا کو بہترین ورک شاپ بنا کر دی اور والدین کے لیے ایک اچھا گھر بھی خرید لیا اگلے دو سال میں جب واپس گھر آیا تو قاسم بھی ساتھ تھا اس نے علی اور اس کے والدین سے زینب کا رشتہ مانگا زینب کمرے کی کھڑکی سے قاسم کو دیکھ رہی تھی اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا دونوں ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے یہ سارا ماجرہ علی اور اس کی ماں دیکھ رہے تھے۔ دوسرے دن قاسم والدین کے ساتھ رشتہ مانگے آ گیا۔ انہوں نے کچھ وقت مانگا۔ دس پندرہ دن میں بات پکی اور سادگی سے نکاح ہو اور قاسم اپنی بیوی زینب کے لے کر جاپان چلا گیا۔ علی کو گاؤں جانا تھا۔ اس لیے وہ اپنے گاؤں چلا گیا وہاں اس نے کونسلر سے ملا اس نے اپنا پروگرام بتایا کہ یہاں ورک شاپ بنانا چاہتا ہوں۔ وہ نیک دل انسان تھا اس نے وعدہ لیا کہ وہ اس کی مدد کرے گا علی نے اپنی زمین سے کچھ حصہ جس پر اس نے قبضہ کیا ہوا تھا ورک شاپ بنائی اور ساتھ پڑھائی کے لیے ایک استاد بھی رکھا۔ جس ورک شاپ ٹرینگ دی جاتی اور باقی وقت میں پڑھائی کی جاتی اور ایک مولوی صاحب جوان کو مذہبی تعلیم قرآن و حدیث پڑھاتے کچھ عرصہ تک علی باہر رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ورک شاپ کو سنبھالنے کے لیے زیادہ افراد کی ضرورت ہے۔ ورک شاپ سے آمدنی آنے لگی جس سے افرادی قوت میں اضافہ بھی کیا گیا۔ علی ایک دن کونسلر کے گھر گیا اس کی بیٹی قرۃ العین جسے عینی کہتے تھے۔ کونسلر نے عینی کو بلا کر کہا چائے بنا کر لاؤ وہ چائے اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں ٹی ٹرالی میں سجا کر لے آئی وہ علی کو دیکھ کر مسکرائی علی بھی مسکرا دیا۔ کونسلر نے عینی کو جانے کو کہا چائے رکھو اور یہاں سے جاؤ علی سے رضامندی مانگی اس نے کہا میں ماں باپ کو لے کر آؤں جب واپس گیا تو اس کے دادا کی طبیعت بہت خراب ہو گئی وہ اسے ہسپتال لے گئے۔ سانس کا مسئلہ تھا کچھ دن آئی سی یو میں رہ جانے کے بعد فوت ہو گیا۔ علی بات نہ کر سکا۔

ایک ماہ گزر گیا اس کے والدین سے بات کی وہ بھی راضی ہو گئے اور عینی کو بیاہ کر شہر لے آئے اب اس ورک شاپ کو علی نے بڑھایا اور ساتھ چند کاریں کرائے پر رکھ لیں جس سے اس کا کاروبار بہت چمک گیا اب اس کے بہن اور بہنوئی بھی واپس پاکستان آئے انہوں نے بھی ان کی مدد کی کچھ عرصہ پاکستان رہنے کے بعد ان کا دل پاکستان میں نہ لگا اور واپس جاپان چلے گئے

۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جب علی ایک معمولی پوسٹ پر اپلائی کی اس کی سی وی اردو میں لکھی ہوئی تھی اور وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ باقی نوجوان بہت اچھی طرح انگلش بول رہے تھے اس کی میں بھی سفارش کی تھی لیکن میری کمپنی کے سربراہ نے مجھے اور علی دونوں کو خوب سنائی اور کمرے سے باہر نکال دیا علی کو صرف انگلش بولنی نہیں آتی تھی مجھے آج بھی افسوس ہے کہ علی جیسے محنتی نوجوان کو ہمارے ادارے نے نوکری نہیں دی۔ آج بھی پاکستان میں اکثر محنتی ہنر اور پڑھے لکھے باہر ممالک میں نوکریاں کر رہے ہیں۔

گونگا پاکستان۔۔۔علی معراج عباسی

مغربی کھڑکی سے ڈوبتے سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ آج ملک کے سب سے بڑے اخبار میں پہلا کالم شائع ہونے کے بسبب کرسی پر بیٹھے دانش کے چہرے پر مسرّتوں کے رنگ بکھرے تھے۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز اور منزلِ مقصود کا ایک اہم سنگِ میل بھی تھا۔

وہ اِن ہی خیالات میں کھویا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے اپنے ہر دل عزیز استاد، جناب رہبر خان صاحب کو موجود پایا، جو کالج میں اس کو عمرانیات پڑھایا کرتے تھے۔ وہ بہت گرم جوشی کے ساتھ اُن سے ملا اور اُن کو کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔ رہبر خان صاحب اندر داخل ہوئے تو کمرے کے ایک کونے میں بہت سے اخبارات کے ساتھ بین الاقوامی جرائد ورسائل کا ڈھیر اور کمرے میں موجود میز پر آج کے تازہ اخبار کے ساتھ بڑی ترتیب سے رکھی فلسفہ، تاریخ، سیاست، معاشیات اور ادبی مضامین پر مشتمل چند کتب اور اُن میں مختلف رنگوں کی لگی یادداشتی پرچیوں کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

استاد صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "میں ادھر سے گزر رہا تھا، تو سوچا تمہیں آج کے چھپے کالم کی مبارک باد ہی دیتا چلوں۔ بہت خوب لکھا ہے تم نے۔ ویسے میں تم سے ایک بات بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ صحافی بننے کا خیال تمہیں کیسے آیا! جب کہ آج کل تو لوگ سرمایہ دار یا سیاست دان بننے کو ترجیح دیتے ہیں؟"

(ان کی یہ بات سن کر دانش کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔)

دوپہر کا وقت تھا اور سورج کی حدت سے گرمی کی شدت ایسی تھی کہ جلسا کے رکھ دے۔ گلی کوچوں میں گشت کرتے لَو کے گرم تھپیڑوں سے بچنے کی خاطر ہر ذی روح کہیں نا کہیں سایہ عافیت تلاش کر چکا تھا، ماحول میں چاروں طرف ھُو کا عالم تھا۔ گلی میں بھاگتا ہوا آہیں اور سسکیاں بھرتا ایک لڑکا نظر آیا، جس کے بال بکھرے ہوئے، کُرتے کے آدھے بٹن کھلے ہوئے اور پاؤں میں بِنا جوتا پہنے تپتی زمین پر بھاگ رہا تھا۔ لڑکے کی آنکھوں سے بہتے آنسو اور کنپٹیوں سے پھوٹتا پسینہ، بہتے ہوئے دو دریاوں کی مانند ملتا اور سسکتے ہونٹوں سے ہوتا ہوا منہ میں داخل ہو کر اس کو نمکین کرتا جب کہ گرد میں لتھڑے پیروں کو تپتی ہوئی زمین جلا رہی تھی۔ وہ ذرا سا رکتا ہاتھ میں پکڑے ریڈیو کو بغل میں دباتا اور کمر کے گرد بندھی دھوتی جو بھاگنے کی وجہ سے ڈھیلی پڑ جاتی، کو کستے ہوئے پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ وہ مسلسل سسکیوں بھری

آواز میں ایک ہی جملہ کہتا چلا جارہا تھا"میرا وطن گونگا ہو گیا!، میرا پاکستان گونگا ہو گیا!"۔

"دانش!!! دانش!!!" اسے اپنے عقب سے مولوی خضر حیات کی آواز سنائی دی، جن کے پاس وہ مسجد میں قرآن پاک پڑھتا اور اسکول میں بھی ان ہی کا شاگرد تھا۔ اپنے شاگرد کو اِس حالت میں یوں تپتی دوپہر میں جوتوں سے عاری پیروں کے ساتھ بھاگتا دیکھ وہ گھبرا گئے اور سائیکل کی رفتار تیز کر کے اُس کے قریب پہنچے اور اُس کو روکا۔ دونوں کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

مولوی خضر حیات نے دانش کی طرف غور سے دیکھا اور اسے روتا ہوا پایا تو اُن کی پریشانی دوچند ہو گئی اور وہ پوچھنے لگے "کیا ہوا؟ اِس طرح اِس حالت میں کہاں بھاگے جا رہے ہو؟"

"ماسٹر جی! ہمارا وطن گونگا ہو گیا، ہمارا پاکستان گونگا ہو گیا!" دانش نے آنسو پونچھتے ہوئے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ اِس پریشان کن حال میں اس طرح کا جواب سن کر ان کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ انھوں نے راستے کے ساتھ لگے بوہڑ کے سائے میں سائیکل کھڑا کیا اور اُس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر اپنے کندھے پر رکھے صافے کے ساتھ اُس کے چہرے کو صاف کیا اور پھر پوچھا۔ "مجھے پوری بات بتاؤ، کیا ہوا ہے؟ اور تم سے کس نے کہا ہے کہ پاکستان گونگا ہو گیا ہے؟"

اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ریڈیو کو مولوی صاحب کے سامنے کیا اور کہا۔ "میرا ابا شہر سے یہ ریڈیو لے کر آیا تھا، اس میں سے بڑے مزے مزے کی آوازیں آتیں جو مجھے بہت پسند تھیں۔ بابا انھیں خبریں کہتا تھا۔ جب میں نے اپنے بابے سے پوچھا کہ یہ کس کی آواز ہے تو اس نے کہا یہ ہمارے وطن پاکستان کی آواز ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ آپ نے ہمیں پڑھایا تھا کہ وطن ماں ہے اور ماں تو ہوتی ہی پیاری ہے۔ اور جب جنگ لگی تھی تب بھی گاؤں کے جو لوگ وطن کو دشمن سے بچانے گئے تھے تو سب لوگ ان کی کتنی تعریف کرتے تھے! اس لیے میں دن رات اپنے وطن کی آواز سننے لگا، کئی چیزیں میری سمجھ میں نہ آتیں مگر میں ان کو سن کے صرف اس لیے خوش ہوتا کہ یہ میرے وطن کی آواز ہے۔ لیکن آج صبح سے اس میں سے عجیب عجیب آوازیں آنے لگیں جیسی آواز وہ منگو نکالتا ہے۔ جسے سب گونگا گونگا کہتے ہیں، میں بہت پریشان ہوا۔ سوچا اپنے اماں بابے کو بتاتا ہوں، مگر وہ دونوں تو صبح ہی صبح کھیتوں میں کام کرنے چلے گئے۔ میں نے دوپہر تک انتظار کیا مگر منگو گونگے جیسی آوازیں ہی آتی رہیں مجھ سے رہا نہ گیا تو میں رونے لگا اور گھر سے دوڑ نکلا تا کہ اپنے بابے کو بتاؤں کہ ہمارا وطن گونگا ہو گیا ہے۔" اور وہ پھر رونے لگا، اُس کو پھر روتا دیکھ مولوی صاحب نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور تھپکی دیتے ہوئے اس کو چپ کروانے لگے۔ اور پھر اس

کے چہرے کو اپنے صافے سے صاف کیا اور کہا "پُتر اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں، چل تو میرے ساتھ چل۔" اُس نے مولوی صاحب کی انگلی پکڑی اور ان کے ساتھ چل دیا۔ سائیکل کو سٹینڈ سے اتار کر وہ اس کی کاٹھی پر بیٹھ گئے اور اُس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اُسے اگلے ڈنڈے پر بیٹھایا اور ریڈیو کو سائیکل کے ساتھ لٹکے تھیلے میں ڈالا اور واپس ہینڈل سے لٹکا کر سائیکل چلانا شروع کر دی۔

مولوی خضر حیات اُس کو گاؤں میں بنی واحد دکان پر لے گئے جہاں سے ضروریات کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ دکان اگرچہ بہت چھوٹی تھی مگر یہ چار کچی دیواریں اور بانسوں کی بنی چھت گاؤں والوں کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ وہ جب مولوی صاحب کے ساتھ دکان میں داخل ہوا تو بہت راحت محسوس کرنے لگا کیوں کہ کچے فرش پر چھڑکے گئے پانی کی وجہ سے دکان کے اندر ٹھنڈک تھی۔ مولوی صاحب نے اس کو ایک پھٹے پر بیٹھایا اور سوتے ہوئے دکاندار کو اٹھا کر ٹھنڈے پانی میں ڈوبے آموں میں سے ایک آم اُس کو لے کر دیا۔ اُس نے ہاتھ میں آم پکڑا اور چوسنا شروع کر دیا مگر اس کی نظریں مولوی صاحب پر ہی ٹکی رہیں جو اس دوران ریڈیو کے ساتھ مصروف تھے۔ ابھی اس نے آدھا آم ہی کھایا تھا کہ اس کی سماعتوں کے ساتھ اس کے وطن کی آواز ٹکرائی اس کے چہرے پر بہار آگئی اور وہ خوشی سے اچھلنے لگا۔ وہ آدھ چوسا آم ایک طرف رکھنے ہی والا تھا کہ مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے اُسے آم ختم کرنے کا کہا، اُس نے جلدی جلدی بقیہ آم ختم کیا اور ریڈیو کو ہاتھ میں پکڑ کر کان کے قریب کر لیا۔ مولوی صاحب نے اُس کو ریڈیو پکڑاتے ہوئے کہا "پُتر میری ایک بات یاد رکھنا وطن کبھی گونگا نہیں ہوتا۔ یہ ریڈیو تو ایک مشین ہے اور اس میں سے آنے والی آواز شہر میں بیٹھے ایک آدمی کی ہے اب کیونکہ وہ ہمیں وطن کے بارے میں بتاتا ہے اس لیے ہم اس کی آواز کو وطن کی آواز کہتے ہیں۔" اُس نے حیرت سے مولوی صاحب کو دیکھا "وہ آدمی کون ہے جس کی آواز کو ہم وطن کی آواز کہتے ہیں؟" مولوی صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کہا "صحافی کی آواز کو وطن کی آواز کہا جاتا ہے۔"

"دراصل بچپن میں مجھے ایک استاد صاحب نے بتایا تھا کہ صحافی وطن کی آواز ہوا کرتا ہے۔ بس اس کے بعد سے صحافی بننے کا شوق پیدا ہوا اور وقت کے ساتھ چراغِ شوق کی لو بڑھتی گئی۔" دانش نے رہبر خان صاحب کے سامنے کٹے ہوئے آموں کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

رہبر خان صاحب نے آم اٹھاتے ہوئے بڑے غور سے دانش کی بات سنی، اُن کی نظریں چارپائی پر پڑے ریڈیو پر جمی تھیں۔ وہ پُر سوچ انداز میں دانش سے مخاطب ہوئے "دانش میاں ایک بات پر غور کرنا کہ کلام کی قوت صرف انسان کو

ملی لیکن آواز تمام جانداروں کو عطا کی گئی۔ پتا ہے کیوں؟ کیوں کہ اُن کو بھی درد کے اظہار کا کوئی نا کوئی ذریعہ تو چاہیے تھا۔ برخوردار! اگر ملک کی آواز بنو تو اس کے درد کا اظہار ضرور کرنا۔"

**

دانش دفتر کے کمرے میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ ویسے تو وہ شروع سے ہی ایک محنت پسند خردمند تھا لیکن پچھلے تین ماہ سے وہ جس منصوبے پر کام کر رہا تھا اُس کے لیے اُس نے صبح و شام میں فرق کیے بغیر جی توڑ محنت کی تھی۔ اُس نے تین دن پہلے ہی اپنے منصوبے کو مکمل کیا اور حتمی منظوری کے لیے افسران اعلیٰ کے پاس بھیجوا دیا تھا۔ اُس کو یقینِ کامل تھا کہ اس نے پانچ برس کی تگ و تاز سے صحافت میں جو نام کمایا اور عوام میں اس کو بطور نوجوان صحافی جو پذیرائی حاصل ہوئی، اگر ان چیزوں کا خیال نہ بھی رکھا گیا تب بھی صحافتی اخلاقیات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے فی الفور اس خبر کو نشر کیا جائے گا۔ آج بار بار اس کو رہبر خان صاحب کے الفاظ یاد آ رہے تھے کہ " برخوردار! اگر ملک کی آواز بنو تو اس کے درد کا اظہار ضرور کرنا۔"

وہ ان ہی خیالات میں کھویا تھا کہ اس کے کمرے میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی وہ اس قدر نڈھال تھا کہ آنکھیں بند کیے کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ "یہ فائل صاحب نے بھیجی ہے۔" کلرک نے کہا۔ یہ الفاظ سنتے ہی اس کی رگوں میں خون سیلابی ریلے کی سی رفتار سے دوڑنے لگا۔ اس نے برق رفتاری سے کرسی کی ٹیک چھوڑی اور میز پر پڑی فائل کو کھولا اور افسران اعلیٰ کا لکھا تبصرہ پڑھنے لگا، تبصرہ پڑھتے ہی جس طرح اس کے سر پر کسی نے برف کا تودا رکھ دیا اور اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تبصرہ یک لفظی تھا۔۔۔" مسترد"۔

اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جواب دے چکی تھی، وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اور غصے سے بھرا اپنی کرسی سے اٹھا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور صاحب کے دفتر کی طرف بڑھا۔

**

رات کی سیاہی دن کے اجالے پر مکمل فتح حاصل کر چکی تھی۔ سڑک مختلف قسم کی سواریوں سے بھری پڑی تھی، بازار میں بھی خریداروں کا ہجوم تھا، ہر کوئی اپنی اپنی خریداری میں مصروف ایک دوسرے سے بے نیاز تھا۔ کچھ لوگ صرف وقت گزاری کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے اور ان سب کی طرح طرح کی آوازیں مل کر ماحول میں شور پیدا کر رہی تھیں۔

مگر دانش اِس سب سے بے نیاز ہاتھ میں آدھ جلا سگریٹ تھامے ایک ہوٹل کے سامنے بنے سبزہ زار میں کرسی پر بیٹھا

آج اپنے دن بھر کے واقعات کو یاد کر رہا تھا کہ کس طرح وہ بلا اجازت اپنے افسر کے کمرے میں داخل ہوا تھا اور ہاتھ میں پکڑی فائل کو اُس کی میز پر پٹختے ہوئے غصے سے بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"آپ نے اس کو کس بنا پر مسترد کیا ہے؟ میں نے ان دلائل و شواہد کو اکٹھا کرنے میں دن رات محنت کی اور آپ نے بغیر کسی وجہ کے اسے مسترد کر دیا؟" اُس نے دانش کی طرف دیکھے بغیر اپنے سامنے کھلی فائل پر کچھ لکھتے ہوئے یوں جواب دیا جس طرح وہ دانش کے اس رویّے کے لیے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھا۔

"دانش ہم اس کو نشر نہیں کر سکتے اور تمھاری کسی بھی دلیل کے ساتھ میرا فیصلہ بدلنے والا نہیں۔"

"کیوں جناب؟ کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا یہ سب سچ نہیں؟ کیا اس میں ملوث لوگ گناہ گار نہیں اور ان کے مکروہ چہروں کو عوام کے سامنے لانا ہماری ذمہ داری نہیں؟ کیا ان کی یہ بد دیانتی اس ملک کو تباہ نہیں کر دے گی؟"

"دانش میں تمھارے صحافتی جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ تم ایک سچے صحافی ہو مگر۔۔۔ ہم کسی طور بھی اس حالت میں نہیں کہ کسی بھی ایسی خبر کو نشر کریں جس سے ملک کے بڑے بڑے سرمایا داروں، حکومت اور حکومتی اداروں کی عزت پر حرف آئے، تم ہماری مجبوریوں کو سمجھو۔" اس نے دانش کے لیے مصنوعی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ دانش حیرانی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر کچھ ٹھہر کر بولا۔

"اگر ہم آواز نہیں اٹھائیں گے تو کون اٹھائے گا؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا یہ ملک گونگا ہو چکا ہے جو خود پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھا سکتا؟" اس کے پاس دانش کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہا مگر اس کی خاموشی میں دانش کے کئی سوالوں کا جواب تھا۔ دانش غصے سے بھرا پڑا تھا۔ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"مجھے میرے ایک استاد نے کہا تھا کہ صحافی وطن کی آواز ہوتا ہے۔۔۔ اور وطن کبھی گونگا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں آپ سے معذرت کرتا ہوں اور میں آپ کے ساتھ مزید کام نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر وہ دفتر سے نکل آیا تھا۔ وہ یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ بیرے نے اس کے سامنے اس کا کچھ دیر پہلے منگوایا ہوا کھانا رکھ دیا اور دانش کے خیالات کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ اس نے کھانے کی طرف دیکھا مگر اس کو اس میں کچھ بھی رغبت محسوس نہ ہوئی حالانکہ اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس نے بے دلی سے ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ اس کے تین صحافی دوست ہاتھوں میں آم کے ملک شیک اٹھائے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

**

کمرے میں رسائل و جرائد بکھرے پڑے تھے۔ دیواروں نے مختلف زبانوں کے اخباری تراشوں کا کاغذی پیراہن پہن رکھا تھا۔ جب کہ ایک دیوار کے ساتھ کتابوں والی الماری میں مختلف مذاہب کی مقدس کتب کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تاریخ، سیاست، معاشیات اور ادب کی بہت سی کتب، جن میں مختلف رنگوں کی یادداشتی پرچیاں لگی تھیں، انتہائی سلیقے سے رکھی گئی تھیں اور کمرے میں جلتا ہوا ایک بلب اپنی ناکافی روشنی کے ساتھ تاریکی کو مات دینے کی کوشش میں جتا تھا۔ دانش گہری سوچ میں ڈوبا اضطرابی کیفیت میں چل رہا تھا۔

اچانک شہر کے بیچ سے گزرنے والی ریل گاڑی کی چنگھاڑ نے اس کو سوچ کے سمندر سے باہر نکالا۔۔۔ مگر اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار اب بھی نمایاں تھے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ ہر گھڑی اس کے گرد پچھتاوے کا اژدھا اپنی گرفت کو مضبوط کر رہا تھا کہ کاش! وہ اس شام ان تینوں سے ملا ہی نہ ہوتا، کاش! وہ ان تینوں کو نہ بتاتا کہ اس نے ملک میں ہونے والی ایک بہت بڑی بددیانتی کی نشاندہی کی ہے جس کو صرف اس وجہ سے نشر نہیں کیا جا رہا کہ اس میں بڑے بڑے سرمایہ دار مگرمچھوں کے ساتھ ساتھ حکومت اور حکومتی اداروں کے بھیڑیوں کے نام بھی آتے ہیں، کاش! وہ ان تینوں کو اپنے ساتھ کام کرنے سے روکا ہوتا، کیوں کہ اس دن کے بعد سے ان تینوں نے انتہائی خفیہ طور پر بین الاقوامی صحافتی اداروں سے روابط قائم کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ اس خبر کو بین الاقوامی سطح پر شائع کروانا چاہتے تھے لیکن پچھلے ایک ہفتے اُن تینوں کی اپنی کچھ خبر نہ تھی اور ان کا یوں لاپتہ ہونا دانش کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ ہر گھڑی اس کا دل وساوس و خدشات کے دلدل میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے میز پر پڑے ریڈیو پر جمی تھیں جس پر مغربی دریچے سے داخل ہوتی چاند کی مدھم کرنیں پڑ رہی تھیں اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تپتی ہوئی دھوپ میں بغیر جوتوں کے دوڑتا ہوا وہی پراگندہ حال بچہ ہے، جو کہہ رہا تھا۔۔۔"میرا وطن گونگا ہو گیا! میرا پاکستان گونگا ہو گیا!"۔۔۔ لیکن آج اس کے عقب میں مولوی خضر حیات کی آواز موجود نہیں تھی!

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کا ملازم اندر داخل ہوا، جس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن کی زنبیل میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اس نے تاسف اور افسوس کے پانیوں سے بھری آنکھوں سے دانش کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ تین نامعلوم افراد نے شہر سے باہر ٹرین کے سامنے آکر خودکشی کر لی ہے۔۔۔"

”اردو میڈیم“

مریم شہزاد

”اگر اب کوئی ٹیچر بھی اردو بولتا نظر آیا تو میں اس کو نوکری سے فارغ کر دوں گی۔ سمجھتے نہیں ہے آپ لوگ! امیج خراب ہوتا ہے ہمارے اسکول کا۔۔۔لاسٹ وارننگ ہے یہ آپ سب کو۔۔۔جب ٹیچر ہی اردو بولیں گے تو بچے کیا خاک انگلش میں بات کریں گے۔“میم رخسار نے مس فرح کو آج پھر کلاس میں اردو بولتے دیکھ لیا تھا اور اسی بات پر تمام ٹیچرز کی کلاس ہو گئی تھی۔ مس تانیہ، جس نے یہ سوچ کر اسکول جوائن کیا تھا کہ بچوں میں اردو بولنے اور اردو سے محبت کا شعور اجاگر کریں گی اب اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نئے طریقے سوچنے لگی۔

تانیہ کے گھر میں شروع ہی سے اردو میں بات چیت کرتے کو خاص اہمیت حاصل رہی تھی۔ اس کے سب بہن بھائی نے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی مگر وہاں بھی اردو بولنے پر ایسی پابندی نہ تھی جو آج کل کے اسکولوں نظر آ رہی تھی۔ ایسے ہی ایک اسکول میں اردو سے محبت اور اہمیت اجاگر کرنے کا عزم لے کر اس نے اس اسکول میں قدم رکھے تھے۔ اپنے انٹرویو میں فر فر انگریزی بول کر اس نے میم رخسار کو بہت متاثر کر دیا تھا اور میم رخسار اس کی آمد سے بہت خوش تھیں کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ ان کا اسکول اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب وہاں کوئی بھی اردو نہ بولے سب انگریزی ہی بولیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ اردو بھی انگریزی میں ہی پڑھاتیں۔

مس فرح اردو کی ٹیچر تھیں اور ظاہر ہی سی بات ہے کہ اردو کا مضمون پڑھاتے وقت انگریزی کیسے بول سکتی تھیں مگر یہ بات میم رخسار کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ کتنے ہی اساتذہ کو اسی وجہ سے فارغ کر چکی تھیں۔

مس تانیہ کو اتنا تو سمجھ آ گیا تھا کہ میم اتنی زیادہ پڑھی ہوئی نہیں ہیں لیکن اپنے اسکول کو چلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں اور یہ ہی بات تانیہ کے لئے فائدہ اٹھانے کے لیے کافی تھی۔

اگست کا مہینہ شروع ہو گیا تھا اسکول بھی کھل گئے تھے اور 14 اگست کی تیاریاں شروع ہو گئیں تھیں۔

تانیہ اجازت لے کر میم رخسار کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”میم ابھی تو روم میں کوئی بھی نہیں ہے کچھ بات اردو میں کر سکتی ہوں؟“ تانیہ نے پوچھا تو وہ بھی نجانے کس موڈ میں تھیں ہاں کر بیٹھیں مگر ساتھ ہی کہہ دیا کہ اس دوران کوئی آ جائے تو فوراًا انگریزی میں ہی بات شروع کر دیں۔

"اوکے میم" تانیہ نے تعبداری سے کہا اور اپنا مدعا پیش کیا۔

'میم آپ کو تو معلوم ہے کہ 14 اگست آ رہی ہے تو ہم کو ملک سے محبت اجاگر کرنے اور اپنے اسکول کا اسٹیٹس ہائی کرنے کے لیے کچھ دوسرے اسکولوں کو اپنے اسکول میں تقریری مقابلے کے لیے مدعو کرنا چاہیے۔ اور اپنے اسکول کے بچوں کو بھی بہت اچھی تقریریں یاد کروانی چاہیے تاکہ وہ دوسرے اسکولوں کے بچوں کو ہرا سکیں۔ تو آپ کہیں تو میں اور اسکولوں سے بات کروں؟"

"یس وائے ناٹ۔ گڈ آئیڈیا۔ آئی ایپریشیٹ یو" میم رخسار نے کہا اتنے میں آفس کے دروازے پر دستک ہوئی کچھ دوسری اساتذہ بھی بات کرنے کے لیے آئیں تھیں تو مس تانیہ نے بہت مشکل انگریزی میں میم سے اجازت لی کہ اور اسکولوں کو تقریری مقابلے کے لیے دعوت نامہ بھیجا جائے گا اور اردو میں بھی تقریریں ہونگی اور میم بھی اردو میں خطاب کریں گی اور آخر میں پوچھا

"آر یو ایگری میم؟"

میم کی سمجھ میں زیادہ کچھ تو نہیں آیا تھا مگر انہوں نے اور دوسری اساتذہ کی طرف دیکھتے ہوئے "یس اوکے" کہہ دیا اور تانیہ فاتحانہ چال چلتی ہوئی باقی اساتذہ کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر آ گئی۔ کیونکہ اس نے تین اساتذہ کو گواہ تو بنا ہی لیا تھا کہ جن کے سامنے میم نے اس کو اوکے کیا تھا۔

مس تانیہ نے بہت جوش وخروش سے بچوں کو تقریری مقابلے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور پوری کوشش تھی کہ میم کے کانوں میں اردو تقریروں کی بھنک بھی نہ پڑے۔

آخر 14 اگست کا دن آ پہنچا۔ اسکول کو سبز ہلالی پرچموں سے سجا دیا گیا۔ دوسرے اسکولوں کے اساتذہ اپنے اسکول کے بچوں کو لے کر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ پروگرام کا آغاز ہوا۔

مس تانیہ نے مائیک سنبھالا اور اردو میں (کمپئرنگ) میزبانی شروع کی۔ میم کا منہ غصے سے لال ہو گیا۔ اور پھر یکے بعد دیگرے اردو میں تقریریں شروع ہو گئیں۔ میم باوجود شدید غصے کے کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں کہ ان کے آس پاس دوسرے اسکول کے اساتذہ بیٹھے تھے اور اس بات کو بہت سراہا جا رہا تھا کہ اردو میں تقریروں کی بدولت بچوں میں جوش اور جذبہ پیدا ہوا ہے۔ پہلی پوزیشن ان کے اسکول نے ہی حاصل کی۔ دوسرے اسکولوں کے اساتذہ نے آخر میں آکر میم کا بہت شکریہ ادا کیا اور تعریف کی کہ اس انگلش میڈیم کے دور میں آپ نے اردو کے فروغ کے لیے اتنا اچھا قدم اٹھایا۔ جس سے میم کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

میم جب تقریر کرنے آئیں تو ان کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تقریر پیش کر دی گئی کہ جس میں دل چاہے کر لیں۔

میم نے چند لمحے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے اردو والی تقریر پڑھنی شروع کر دی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھیں کہ اردو بولنے والے بھی ترقی کر سکتے ہیں۔۔۔

گونگا پاکستان۔۔۔ محمد آصف اسحاق (کراچی)

عمران نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی، میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکا۔ اسکے والد بڑھی کا کام کرتے تھے، وہ بھی فارغ وقت میں اپنے ابا کی دکان پر چلا جاتا تھا، اسکے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں، کُل گھر کے سات افراد تھے، مہنگائی دن بدن بڑھتی جارہی تھی، گھر کا سودا سلف لانا مشکل ہو گیا تھا، اسکے ساتھ ساتھ بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، اسی طرح بجلی کے بل میں ہر ماہ حکومت اضافہ کر رہی تھی، پاکستان میں رہنے والے بے حس اور مردہ ضمیر لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ غریبوں کی زکوٰۃ تک کھا جاتے ہیں، اور پھر با آواز بلند کہتے ہیں کے پاکستان زندہ باد، یہ سب حکومت کی ناقص پالیسوں کی وجہ سے ہو رہا ہے اور حکومتی ارکان خاموش تماشائی بن کر تماشہ دیکھنے کے لیے تیار ہیں،

یوں ہی آس و امید کے سہارے دو برس اور گزر گئے، اور زاہد کے گھر والے اب قرضے کے بوجھ تلے دبتے جارہے تھے،

ایک دن صبح ناشتہ سے فارغ ہونے اور بہن بھائیوں کو اسکول چھوڑ کر آنے کے بعد کچھ دیر کے لیے چارپائی پر لیٹا۔ اور سوچوں کی وادیوں میں ڈوب گیا، لیکن اسکے دماغ میں کوئی مناسب حل سمجھ نہیں آرہا تھا، اور وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پاکستان میں رہتے ہوئے وہ اپنے گھر کے حالات کیسے بدلے گا؟ پھر اسکے ذہن ایک دم یہ خیال آیا کہ میرا ایک دوست جوتے کی دکان میں کام کرتا ہے، اسکو بولتا ہوں کہ اللہ کے واسطے آپ اپنے مالک سے بات کرو کہ مجھے کام کے لیے اپنی دکان میں رکھ لے، وہ اپنے گھر سے نکلتا ہے تو اسکے پاس ایک طرف کا کرایہ ہے، سوچنے لگا کہ میں چلا تو جاؤں گا واپس گھر کیسے آؤں گا، میری جیب میں تو واپسی کا تو کرایہ ہی نہیں، اللہ کا نام لیکر وہ گھر سے نکلتا ہے، سڑک پر پہنچ کر اسٹاپ پر جانے کے بجائے پیدل ہی صدر بازار جانے والے راستے پر چل پڑتا ہے، ابھی کچھ ہی قدم پیدل چلا ہو گا کہ اُسے ایک گدھا گاڑی آتی دکھائی دی، جیسے ایک باریش بزرگ چلا رہے تھے، عمران نے انہیں انتہائی ادب کے ساتھ روکنے کے لیے کہا، باباجی مجھے آپ صدر بازار تک چھوڑ دیں، باباجی نے کہا کہ آو بیٹا گرمی بہت شدید ہے، میں تمہیں صدر بازار تک چھوڑ دیتا ہوں، عمران نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ باباجی کی شکل میں اس وقت فرشتہ بھیج دیا ہے، اسٹاپ پر اُتر کر عمران نے اپنے دوست کی دکان مارکیٹ میں تلاش کرنے لگا، کچھ ہی دیر بعد اسے اپنے

دوست کی دکان مل گئی۔ عمران کو جب اپنا دوست عارف نظر آیا تو اسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے، کیونکہ پانچویں جماعت سے دسویں تک دونوں بہت اچھے دوست تھے تو پورے اسکول میں انکی دوستی کی مثال دی جاتی تھی، اپنی جماعت میں دونوں پوزیشن لیا کرتے تھے۔ اک دم جب عارف کو دیکھا تو اس نے اپنے جگری دوست کو فورا پہچان لیا اور اپنے پیارے دوست کو گلے لگا لیا، اور آنے کا مدعا درفیات کیا، تو عمران نے اپنے تمام گھر کے حالات عارف کو بتائے۔ عارف نے یقین کروایا کہ آج میں اپنے مالک سے بات کر کے آپ کو شام تک آپ کے گھر آکر بتا جاؤں گا، عمران نے کہا کہ میرے دوست میں تاحیات تمہارا یہ احسان نہیں بھول سکتا، عمران نے مسکراتے ہوئے کہا کہ عمران آپ پریشان نہ ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور مجھے دلی اُمید ہے کہ میرا دوست اس امتحان میں بھی سرخرو ہوگا، میرے دوست میر املک گونگا ہو گیا ہے، حکومتی پالیسی کی وجہ سے ہزاروں لوگ بے روزگار ہو گئے ہیں ہر طرف چھینا جھپٹی کا راج ہے، جو محافظ ہیں وہ ہی سب سے بڑے چور ہیں، کب ہمارے ارباب حکومت اپنی رعایا کی آواز سنے گے، قانون تو ہمارے دستور میں موجود ہیں، لیکن بد قسمتی یہ سارے قوانین غریبوں کے لیے ہیں، امراء طبقہ اس سے مستثنٰی ہیں، ہزاروں کے قریب فیکٹریاں گیس کی بندش کی وجہ سے بند ہو گئی ہیں، آپ فکر نہ کرو میں کوشش کرتا ہوں، عمران بوجھل قدموں کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوتا ہے، گھر پہنچ کر والدہ محترمہ کو دن بھر کی رواد سناتا ہے والدہ محترمہ اُسے صبر اور برداشت کی تلقین کرتی ہیں اور ناصحانہ انداز میں نصیحت کرتی ہیں کہ عمران بیٹا کبھی بھی زندگی میں حرام کا لقمہ گھر لیے کر نہ آنا، چوری ڈاکے سے دور رہنا، اچھے دوستوں کی صحبت اختیار کرو اور بیٹا اللہ سے مانگو وہ بڑا غفور رحیم ہے سب کی سنتا ہے، وہ سب کی نیتوں کا حال بہ خوبی جانتا ہے، نماز میں کوتاہی نہ کرنا، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں عمران اپنی والدہ محترمہ سے کہتا ہے کہ والد صاحب سخت مزدوری کر کر کے اب بہت کمزور ہو گئے ہیں وہ پھر بھی ہم سب کی فکر میں لگے ہوئے ہیں منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں اور رات کو اندھیرے میں واپس آتے ہیں، کبھی غصہ نہیں کرتے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے، حالات کو دیکھ کر سمجھوتہ کر رہے ہیں، اب کو تمام حالات کا بہ خوبی علم ہے ابھی کل ہی دودھ والا کہہ رہا تھا کہ حکومت نے دودھ ۲۳۰ پر کلو کر دیا ہے، ایک ماہ کا دودھ کا بل ۱۳۰۰۰ روپیے بنے گا، یہ سب گھر کے خرچ کیسے پورے ہوں گے۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی، اس ماہ بہن بھائیوں کی فیس کیسے ادا ہو گی، وہ باتیں کرتے کرتے ہی سامنے کمرئے کی جانب چلا جاتا ہے، اسکی والدہ نے جلدی جلدی اپنے آنسو صاف کیے جو کب سے وہ روکنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اگر میرے آنسو نکل آئے تو میرا بیٹا اور پریشان ہو جائے گا،

ادھر عمران بے صبری سے شام ہونے کا انتظار کر رہا تھا، رات آٹھ بجے کے قریب اسکا دوست عارف آیا، اور اس نے کہا کہ اسکے مالک نے کہا ہے کہ ہم ۱۵ دن بغیر تنخواہ کے اس کو رکھیں گے، ہم یہ دیکھیں گے کہ دکان پر آنے والے بندؤں کے ساتھ عمران کا رویہ کیسا ہے، عادتیں کیسی ہیں کتنا ایماندار ہے کیونہ کہ میرے دوست شاہد آپ کو معلوم نہ ہو کہ ہمارے مالکوں کی دکان صدر بازار کی پرانی دکان ہے، اعتماد کی وجہ سے ہمارے پاس ہر وقت بھیڑ ورش کا عالم ہوتا ہے، اس تمام صورت حال کو آپ کس طرح ترتیب سے کرتے ہو، ان تمام چیزوں کو وہ نوٹ کریں گے کہ اگر یہ ہمارے معیار پر پورا اُترتا ہے تو ہم اسکو اپنی دکان میں ملازم رکھ لیں گے، اور اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے تم کام سیکھ جاوگے، آج کسی بھی دکان میں کام کے لیے جاو تو وہ پہلے ضمانت مانگتے ہیں، میں نے انکو تفصیلا بتادیا ہے کہ میرا دوست ہیرا ہے، ایماندار ہے، کل کا دن مکمل سوچ لو اور پرسوں ۱۱ بجے میری دکان پر آجانا، وہ اپنے جگری دوست کو باہر تک چھوڑنے کے لیے آیا ، رات کا کھانا کھا کر نماز زادا کی اور اللہ تعالیٰ سے رورو کر دعا کی، یا اللہ میری مشکل آسان کر دے، میرئے لیے آسانی والا معاملہ کر دے، تاکہ میں تیرے دربار میں سرخرو ہو سکوں، نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے اپنے والد متحرم کے پاس آیا اُن سے ان کی خیریت درفیات کی، اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ سونے کے لیے اپنے کمرے کے جانب چل پڑتا ہے، اپنے بستر کی چادر درست کرتا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو اب تو بستر کی چادر بھی جگہ جگہ سے پھٹ رہی ہے، بستر پر لیٹتے ہی پھر اسے چاروں طرف سے سوچوں نے گھیر لیا، اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسکی آنکھ لگی گی، صبح اذان کی پہلی آواز پر عمران کی آنکھ کھل گئی، غسل وطہارت سے فارغ ہونے کے بعد مسجد کی جانب نماز فجر کے لیے روانہ ہوتا ہے واپس گھر آکر ناشتہ کرنے کر اپنے ماہ بہن بھائیوں کو اسکول چھوڑنے چلا جاتا، واپس آکر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اپنے دوست کی دکان پر جائے گا، اور ثابت کریں گا کہ وہ انتہائی ایماندار و دیانت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے یہ منصوبہ بندی بھی کر لی کہ وہ کسطرح کل عارف کی دکان پر جائے گا اور ۱۵ دن بغیر تنخواہ پر کام کرے گا، دوسرے دن وہ وقت کے مطابق وہ دکان پر پہنچا عارف نے اپنے مالک کے بیٹے سے اسکی ملاقات کروائی، تو انھوں نے کچھ سوالات عمران سے کیے اور مطمعین ہونے کے بعد پھر عارف سے کہا عمران کو کام سمجھا دیں، عارف نے عمران سے کہا کہ آپ کل سے ۱۱ بجے تا ۸ بجے تک ہماری دکان میں کام کروگے، آپ کو دو وقت چائے اور دوپہر کا کھانا دیا جائے گا۔ عمران نے پوری دلجمی ولگن سے پورا ایک ماہ کام کیا اور سب کی آنکھوں کا تارہ بن گیا، دکان کا مالک بھی خوش اور دکان میں کام کرنے والے تمام ملازم بھی بہت خوش تھے، جب عمران کا ایک ماہ مکمل ہوا تو اسے ۱۵ دن کی تنخواہ دی گی۔

تنخواہ ملنے کے بعد وہ سیدھا فروٹ و مٹھائی کی دکان پر گیا بہن بھائیوں کے لیے فروٹ و مٹھائی لی، اور بقیہ تنخواہ کے پیسے اپنی والدہ محترمہ کو دیے والد نے شفقت و پیار سے گلے لگا لیا، یوں ہی دن گزرتے گئے دکان میں کام کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔

ایک رات وہ دکان بند کر کے گھر آ رہا تھا، گلی میں کافی اندھیرا تھا، راستے میں گلی کے کونے پر پولیس کا ناکہ لگا ہوا تھا، پولیس کے اہلکار تلاشی لینے لگے اور عمران کی جیب سے ۲۰۰۰ ہزار روپیے نکال لیے اور غصہ کرتے ہوئے اُسے کہا کہ سیدھے گھر جاؤ، عمران بیچارہ بوجھل قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہوا، سارے راستے وہ یہ سوچتا رہا کہ یہ ہمارے محافظ ہیں یا ڈاکو پاکستان میں رہنے والے لوگوں کے باہر جانے کی وجہ یہ ہی کہ یہاں نہ مال، و جان محفوظ ہے، عزتیں سرعام پامال ہو رہی ہے، اندھر نگی چوپٹ راج نظر آ رہا ہے، صوبوں کی حکومتیں کٹھ پتلی تماشے کی طرح ناچ رہی ہیں اور حکم کے غلام نظر آ رہے ہیں، غریب کی کوئی سنائی نہیں ہے تو ایسے ملکوں کو لوگ گونگا کہ کر مخاطب کرتے ہیں، رات وہ خاموشی سے سو گیا صبح اپنے والد محترم کو رات کی رُوداد سنائی جس کو سن کر وہ بھی آبدیدہ ہو گے، بیٹے کو صبر کی تلقین کی۔

دوسرے دن جب وہ کام پر جانے لگا تو راستے میں اپنے اسکول کے استاد محترم سر خالد مل گے، عمران نے جھک کر سر کو اسلام علیکم کہا، سر خالد کی وہ زمانہ طالب علمی بھی بہت عزت کیا کرتا تھا، سر خالد بھی اُس سے پیار و شفقت سے پیش آتے، سر خالد نے عمران سے پوچھا کہ بیٹا آج کل کیا کر رہے ہو، تو عمران نے تفصیل کے ساتھ اپنے گھر کی تمام داستان سر کو بتا دی، سر نے بڑے سکون و اطمینان سے عمران کی بات سنی اور گویا ہوئے کہ سب سے پہلے عمران آپ اپنی اُدھوری تعلیم مکمل کرو، مجھے پتہ ہے آج کل کے دور میں یہ بہت مشکل کام ہے، مہنگائی کا گراف دن بہ دن اُوپر جا رہا ہے، لیکن ایک بات میری ہمیشہ یاد رکھنا کہ جس نے بھی پایا مشکل سے پایا۔ ایسا کرو کل صبح تم ۹ بجے اسکول آ جانا، میرے ایک دوست سر عاطف کالج میں پڑھاتے ہیں، رات میں انکے گھر جاؤں گا اور تمہارے لیے بات کروں گا۔ عمران اپنے استاد محترم سے بات کرنے کے بعد سیدھا دکان پر پہنچا، آج وہ اندر سے بہت مطمئن نظر آ رہا تھا، اُسے یوں لگ رہا کہ کسی نے اندھری رات میں شمع جلا دی ہو، آج اسے دکان پر کام کرنے کا بھی مزہ آ رہا تھا، رات کو اس نے دکان بند کی اور گھر آ گیا، اُس رات اس نے سکون کی نیند لی کیونکہ اسے اُسکے ہر دل عزیز سر خالد نے اُسے تعلیم کی اہمیت پر بہت خوبصورت بتائیں اور کہا کہ ابھی آپ کے پاس وقت ہے کل یہ وقت گزر گیا تو دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ دوسرے دن صبح معمولات کے کام سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا اپنے اسکول پہنچا، اُسکے استاد محترم جمات دہم میں لیکچر دے رہے تھے،

عمران نے کچھ دیر انتظار کیا اور کچھ ہی دیر بعد سر جماعت سے باہر آئے مجھے دیکھا انتہائی شفقت کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ اساتذہ کے اسٹاف روم میں لے گئے، سر نے کہا کہ میں نے کل رات اپنے دوست سر عاطف سے تمہاری بات کی ہے انھوں نے کہا کہ اگلے ماہ انٹر میڈیٹ کے داخلہ فارم جا رہے ہیں تو آپ جلد از جلد اپنا فارم پرائیوٹ جمع کروادیں اور وہ تمہیں آسان مضامین بھی بتائے گے جنکی تیاری تم دکان میں کام کے ساتھ آسانی سے کرسکتے ہو، میں نے تمہارے بتایا کہ وہ کہ رہے ہیں کہ میرا کالج دوپہر میں ہوتا ہے، اگر عمران ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ میرے پاس آئے میں اسکو ان مضامین کی تیاری کروادوں گا، دن ایسے ہی گزرتے گئے عمران دن رات محنت کی اور انٹر میڈیٹ کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی۔ عمران خوشی خوشی اپنے استاد محترم سر خالد کے پاس مٹھائی لیکر گیا اُن کو اپنے نتیجے کے بارے میں بتایا تو سر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے۔ نتیجے کے بعد عمران نے کتنے ہی دفتروں کے نوکری کے لیے چکر لگائے لیکن ہر کوئی سفارش اور تجربے کا بہانہ بنا کر آفس سے نکال دیتے۔ خالد نے دلبرداشتہ ہو کر تہیہ کر لیا کہ وہ اب کھی بھی اس گونگے ملک میں کس سے نوکری کی بات نہیں کریں گا ،اس نے ایک کمیٹی ڈال کر اور کچھ پیسے ادھار لیکر صدر بازار میں اسٹشنری کی دکان بنالی، اور اس طرح آج بھی وہ سوچوں میں گم دکان پر جاتا ہے، اور پھر تھکا ہارا گھر واپس آجاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ ہمارا ملک گونگا ہے۔۔۔۔۔۔۔

دستور یہاں بھی گونگے ہیں، فرمان یہاں بھی اندھے ہیں

اے دوست خدا کا نام لے ایمان یہاں بھی اندھے ہیں

(ساغر صدیقی)

ہمارا مطالبہ

دستورِ پاکستان کے مطابق نفاذِ قومی زبان اختیاری نہیں لازمی تقاضا ہے، اس لیے:

- تمام سرکاری، نیم سرکاری اور نجی دفاتر کا نظام انگریزی کے بجائے اردو میں چلایا جائے۔
- تمام ملکی اور کثیر القومی تجارتی کمپنیوں کا نظام اردو میں چلایا جائے۔
- پاکستان میں فروخت کے لیے پیش کردہ مصنوعات / خدمات کا تمام تر مواد اردو میں پیش کیا جائے۔
- تمام ملازمتوں (سرکاری و نجی) کے امتحانات قومی زبان میں لیے جائیں۔
- پورے ملک میں یکساں نصاب تعلیم قومی زبان میں رائج کیا جائے۔
- غیر ملکی تعلیمی نصابوں پر پابندی عائد کی جائے۔

دستور شکنی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

دستورِ پاکستان کی شق 251 پر 13 اگست 1988 سے عمل کرنا لازم تھا جس کی خلاف ورزی کرنے والے تمام حکمرانوں، بیوروکریٹوں اور ذمہ داروں کو دستور کے مطابق قرار واقعی سزا دی جائے تاکہ ملک میں قانون کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

توہینِ عدالت کے مجرموں کو سزا دی جائے۔

8 ستمبر 2015 کے سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق قومی زبان کو فوری طور پر نافذ کیا جانا تھا، اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے والے تمام ذمہ داران کو توہینِ عدالت کے تحت قرار واقعی سزا دے کر عدالتی فیصلوں کی بے توقیری کو ختم کیا جائے۔

تحریک نفاذِ اردو پاکستان

Fb/TNUPAK, Twitter/TNUPAK, 03495059760

گونگا پاکستان

سجل راجہ اسلام آباد

کاٹو تو ایک قطرہ خون کا نہ نکلے کچھ ایسی ہی حالت ہو رہی تھی میری۔ کوئی ی تیسرے سر کے سامنے میری پیشی تھی۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں کوئی ی مجرم ہوں جو عدالت میں پیشیاں بھگت رہا ہوں نہیں بلکہ میں پڑھا لکھا اعلی سند یافتہ یعنی جدید لہجے میں کہوں تو ڈگری ہولڈر ہوں لیکن نوکری کے لیے دھکوں پہ دھکے کھائے جا رہا ہوں، نوکری ہے کہ ملنے کا نام نہیں لے رہی۔ اب نوکری کوئی ی مالِ گمشدہ ہے جو مل جائے؟ میں اپنی تعلیمی اسناد پر اترا رہا تھا کہ اتنے اعلی ترین نمبروں کے ساتھ اتنی اعلی ترین سند حاصل کی اب جہاں بھی یہ کاغذ کی پرچی دکھاؤں گا فوراً ہی ماسٹر کی کرسی پر بٹھا دیا جاؤں گا۔ لیکن آج تیسری بار سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ وجہ کیا ہے؟ مجھے قابلیت کی بنا پر مقبولیت کیوں نہیں دی جا رہی ہے؟ میرا جرم کیا ہے؟ چھوڑئیے میری زبانی سننے کے بجائے یہ مجھے مسترد کرنے والے ان تیسرے باس سے پوچھتے ہیں۔

”سر! کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ میری اسناد میں کیا طاقت ہے کہ جن کو دیکھ کر مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا جاتا ہے لیکن میرے لفظوں میں کیا کمی ہے کہ سنتے ہی ٹھکرا دئیے جاتے ہیں اور نوکری سے انکار کر دیا جاتا ہے۔؟“

جواب سن کر پاؤں سے زمین کیا نکلتی میں پورے کا پورا زمین کے اندر چلا گیا بلکہ شرم سے زمین میں گھڑ گیا۔ موصوف فرما رہے تھے ”ذرا اپنی لنگوتیج پر غور کریں انٹرنیشنل لینگویج کا ایک ورڈ بھی آپ نے اپنے میں انٹرومیویوز نہیں کیا۔ ایکچولی ہم جاب اسے آفر کرتے ہیں جو 80 پرسنٹ انگلش لینگویج یوز کرتا ہے اپنی کنورسیشن میں“ ہونٹوں کے مختلف زاویے بناتے ہوئے باس کے اس جواب کے جواب میں میرے پاس کوئی ی سوال نہ تھا اب۔ چپ چاپ اٹھا گیا کیونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا یہاں غلاموں کو اپنی بیڑیوں سے پیار ہو گیا ہے اب آزادی کا نہیں سوچا جا سکتا۔ حکومت کا ایک طرف اردو زبان کے نفاذ کے لیے قانون بنانا اور دوسری طرف اردو بولنے پڑھنے اور پڑھانے والوں سے ناروا سلوک ذہنی غلامی کی واضح دلیل تھی۔

*****

میرے والد ایک بہت اچھے قلم کار تھے، میدان سخن کے فاتح تھے۔ اردو سے محبت یہاں تک تھی کہ کہا کرتے تھے کہ

"مجھے اردو اور اچھی اردو بولنے والوں سے خوشبو آتی ہے"

ایسے لوگوں سے ملاپ کے بعد والد صاحب اکثر یہ شعر پڑھتے تھے

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

یہ والد صاحب کا شوق لگن تھی کہ یہی اردو سے محبت کا جنون میری رگوں میں شامل ہونے لگا۔ ہر جماعت میں سب سے زیادہ نمبر اردو میں لیتا اور ایک دن اردو میں ہی اعلی تعلیم کی ڈگری حاصل کر لی میرے مقالے کا موضوع بھی "اردو زبان کی تاریخ" تھا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ اردو کی ترویج کے لیے کتابوں اور مشاعروں کی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی نسل کو اردو زبان سے روشناس کروایا جائے۔ اردو کی چند کتابوں یا سالانہ چند مشاعروں سے زبان زندہ نہیں رہ سکتی اس کے لیے نسلوں کو اپنی زبان پڑھنی ہو گی پڑھانی ہو گی۔ اس کے لیے میں نے تعلیم کے شعبے کا انتخاب کیا۔ جب تین بار ٹھکرانے کی اذیت سہی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنا ذاتی تعلیمی ادارہ کھول لوں اور بچوں کو بنیاد ہی سے اپنی قومی زبان میں تعلیم دوں۔ اردو کا رشتہ نوکری سے نہیں جڑ رہا تو چھوڑ دیا غمِ نوکری۔ مان لیا جیسے وطن، والدین اور دین کا تعلق روزی روٹی سے نہیں بلکہ احساس سے ہوتا ہے ایسے ہی اپنی زبان سے رشتہ بھی ہے۔ صرف بابا ہی میری پریشانی سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے میں نے اپنی پریشانی کو بابا کے سامنے رکھا اور جو ایک وسیع گھر انہوں نے کرائے پر لگا رکھا تھا اسے خالی کروا کر وہاں مدرسہ شروع کرنے کی تجویز پیش کی۔ والد صاحب چونکہ ایک تو بہت سی آبائی زمین تھی اور دوسرا انہیں تعلیم و تعلم سے بہت لگاؤ تھا اس لیے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اجازت دے دی۔

میں نے مدرسے کے تمام مضامین کی کتابیں اردو زبان میں پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے میں نے بہت تعلیم یافتہ ترجمان مقرر کیے جو جدید اصطلاحات کو اردو زبان میں ترجمہ کرتے۔ ہر مضمون کا ماہر استاد مقرر کیا پڑھانے کو۔ لوگوں کا اعتماد تھا مجھ پر کہ پہلے ہی سال طلبا کی بڑی تعداد داخل ہوئی۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ عوام اردو زبان سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن تعلیمی سال میں کچھ والدین کی طرف سے بار بار شکایات موصول ہوتی رہیں کہ "ہمارے بچوں کی انگلش بہت ویک ہے"۔ کچھ اور والدین کا کہنا تھا کہ "ہمارے بچوں کو اردو لکھنا پڑھنا بہت مشکل لگتی ہے ان کے سبجیکٹ انگلش میں کر دیں"۔ پھر تو کچھ طلبا نے خود بھی کہنا شروع کر دیا کہ اردو میں پڑھنا مشکل ہے۔ کچھ کو اردو رسم الخط مشکل لگتا۔ پھر ایک دن ایک طالب علم کے والد تشریف لائے اور یوں دھاڑے جیسے میں نے اردو مدرسہ کھول کر کوئی جرم کر دیا ہے کہنے لگے "میرے بھائی کے

بچے جس اسکول میں پڑھتے ہیں وہاں اسلامیات کا سبجیکٹ بھی انگلش میں ہے اور ایک یہ اسکول ہے جہاں ہمارے بچوں کو میتھ کا سبجیکٹ بھی اردو میں پڑھایا جاتا ہے میں اپنے بچوں کا مستقبل یہاں برباد نہیں کرواسکتا کائنڈلی ان کے سرٹفیکیٹ دے دیں میں انہیں اسی اسکول میں ایڈمیشن دلواؤں"۔ کافی مشکل سے انہیں رضامند کیا کہ یہ تعلیمی سال مکمل کرنے دیں بچوں کو آئندہ سال وہاں داخلہ دلوا دینا۔ خیر ایسی بہت سی باتیں پورا سال سننے کو ملیں اور امتحانات ختم ہوتے ہی تقریباً پچانوے فیصد والدین اپنے بچے میرے ادارے سے نکال لے گے۔ بہت دل برداشتہ ہوا۔ لیکن اتنی سی خوشی ضرور تھی کہ ابھی پانچ فیصد اپنی زبان سے محبت کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ اس ایک سال میں جہاں بہت کچھ سیکھا وہاں زندگی کی گاڑی میں ایک اور سوار شامل ہو گیا جسے رفیقۂ حیات کہہ کر میرے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ اب ذمہ داری بڑھ گی تو پیسہ بھی زیادہ چاہیے تھا۔ محسوس ہوتا تھا حکومت نے تو "بے روزگار سکیم" شروع کر رکھی ہے اور ذاتی ادارے کا حال آپ جان چکے ہیں۔ ان سب کا حل میں نے یہ جانا کہ مجھے دوبارہ سے تعلیم شروع کرنے چاہیے وہ بھی غیروں کی زبان میں۔ میں نے داخلہ لیا دو سال دن رات محنت کی اتنے اچھے نمبر تو نہ حاصل کیے جتنے اپنی زبان کی تعلیم میں لیے تھے لیکن پھر بھی کچھ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو ہی گیا۔ اپنی زبان سے تو محبت تھی اور غیروں کی زبان ضرورت بن گی بس جتنے ضروری تھے اتنے نمبر مل ہی گے۔ جلد ہی میں پھر نوکری کا متلاشی بن کر ادھر سے ادھر پھرنے لگا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب میری ساری ڈگریوں پر یہ ایک غیر ملکی زبان کی ڈگری سبقت لے گی۔ پھر انٹرویو دیتے ہوئے میں نے بھی خوب منہ ٹیڑھے میڑھے کیے۔ ان الٹے پھلٹے منہ کے زاویوں کا یہ فائدہ ہوا کہ جلد ہی مجھے نوکری کا بلاوا آ گیا۔ اب میں بھی خوش گھر والوں کی بھی اداسی کم ہو گی۔ لیکن مجھے لگتا ہے میں گونگا ہو گیا ہوں یہ بناوٹی زبان مجھے راس نہیں آ رہی۔ میرے اپنے وطن میں میری اپنی زبان بے وطن ہے۔ اردو کی یہ دربدری اور غریب وطنی کی جو حالت ہے دنیا کہ کسی بھی ملک کی زبان کی نہیں۔ میں جو سوچتا تھا اردو کو تنازعہ نہیں مکالمہ بنانا ہے میں وقت حکومت اور پیٹ کے آگے ہار گیا۔ اردو سے بچپن کی محبت میرے دل میں اب بھی اسی طرح موجزن ہے لیکن تعفن زدہ سوچوں نے میری محبت کو زنگ آلودہ کر دیا۔ میں ذہنی غلامی کا شکار ہونے لگا ہوں۔ میری سوچ کا دائرہ وسیع کیا ہو گا الٹا انگریزی بول چال نے اسے تنگ کر دیا۔ جس کی زبان بولنے لگا ہوں اسی کی طرح سوچنے لگا ہوں۔ جن کی زبان بولی جائے انہیں ہی تو حقِ حکمرانی بھی ہوتا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے پاکستان مجھ سے شکوہ کناں ہے کہ ایک اور "مردِ سخن" مجھے گونگا کر رہے۔

گونگا پاکستان

طیبہ رفیق، اسلام آباد

وہ تنہا کھڑا اپنی زمین کے اس ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا جو کہ اب اس کا نہیں رہا تھا۔ عدلیہ کی ناانصافی پر وہ بہت افسردہ تھا۔ اس کی غلطی صرف اتنی تھی کہ وہ غریب تھا اور یہاں سارا کرپٹ سسٹم چل رہا تھا جو پیسے والا ہوتا ہے ساتھ صرف اسی کا دیا جاتا ہے۔ جو طاقتور ہوتا ہے صرف اسی کی سنی جاتی ہے۔ یہاں سارے کا سارا نظام ہی بگڑ چکا ہے۔ وہ پاکستان جو قائد اعظم نے بنایا تھا اور آج کا پاکستان مکمل طور پہ بدل چکا ہے۔

اس کو آج بھی یاد تھا جب وہ عدالت میں کورٹ کچہری میں وکیلوں کے پیچھے بھاگتا تھا لیکن کوئ ی اس کی بات کو سننے والا نا تھا۔ وہ اس آس پہ وہاں جاتا کہ شائد کوئ ی تو اس کو انصاف دلوائے گا لیکن اس کی زمین پر قبضہ کرنے والوں کے پاس بہت ذرائ ع تھے بہت پہچان تھی بہت پیسہ تھا جس کی وجہ سے سب ان کے ساتھ ہی تھے۔ سب ان کی ہی سنتے تھے، یا پھر ایسا کہہ سکتے ہیں کہ سب کچھ ان کے ہی ہاتھ میں تھا۔

ہماری حکومت کی غلطیاں بے چارے غریب اور لاچار بندوں کو ہی بھگتنا پڑتی ہیں۔ حکومت کو چاہ ئ ے کہ وہ عام عوام کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ کرے جیسا برتاؤ کسی بڑے طبقے کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن عام عوام اور بڑے طبقے میں بہت فرق رکھا جاتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ناانصافی کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں اور ہماری حکومت کو کوئ فرق نہیں پڑتا۔ اور عام انسان بھی اپنے اوپر ہوتے ظلم کو برداشت کرتا ہے بجائے اپنے ل ئ ے آواز اٹھانے کے۔ اور جو لوگ ہمت کر کے آواز اٹھا بھی لیں تو ان کی آواز کو دبالیا جاتا ہے۔ ان کو پیسوں کی دھونس دکھائ ی جاتی ہے، یا پھر ان کی کسی کمزوری کو پکڑ کر بلیک میل کیا جاتا ہے۔ یہ کمزور معاشرہ اپنے ل ئ ے کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ حکومت کا غیر منظم نظام کچھ کرنے نہیں دیتا۔ یہاں پاکستان گونگا ہونے کہ ساتھ ساتھ بہرہ بھی بن جاتا ہے تاکہ کچھ سن بھی نا سکے کیونکہ اگر کچھ سن کے بولنے کی کوشش کرے گا تو اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ وہ بھی ان لوگوں میں سے تھا جس نے اپنے ل ئ ے آواز اٹھائ ی تھی۔ اپنے خاندان کے ل ئ ے آواز اٹھائ ی تھی۔

محتسم اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ ایک سرکاری دفتر میں چھوٹی سی نوکری کرتا تھا جس کی تنخواہ سے مہینے بھر کا خرچہ مشکل سے پورا ہو جاتا تھا۔ اس نے اپنی جمع پونجی اور کچھ وراثت سے ملے حصے سے ایک جگہ خریدی تھی لیکن اس جگہ پر کسی بڑے امیر آدمی کی نظر تھی اور وہ جگہ ہڑپنا چاہتا تھا۔

اس امیر آدمی نے اس جگہ ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ جب بات کرنے سے وہ نامانا تو محتسم نے اپنا کیس کورٹ میں درج کر لیا یہ سوچ کر کے اس کو انصاف ملے گا۔ وہ اس سارے معاملے میں تن و تنہا تھا کوئی بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ کورٹ میں تاریخ پہ تاریخ دی جا رہی تھی۔ اس کی ساری جمع پونجی لٹ رہی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو کبھی کبھی فاقوں پہ گزارا کر رہے تھے۔ لیکن انہیں ایک امید تھی کہ عدالت میں حق پہ فیصلہ ہو گا اور جیت ان کی ہو گی وہ انصاف کی امید لیے انتظار کی گھڑیاں طے کر رہے تھے۔ ان کا انتظار طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

آخر کار 3 سال کے طویل عرصے کے انتظار اور چکروں کے بعد جب کورٹ میں پیشی ہوئی تو محتسم اس امید پر کورٹ گیا کہ شائد آج اس کی دہائی سن لی جائے اور اس کو انصاف مل جائے۔ کورٹ میں وکلاِ اور مخالف پارٹی بہت اعتماد کے ساتھ بیٹھے تھے۔ خیر وہ بھی جا کر بیٹھ گیا۔ وکلاِ کی بحث شروع ہوئی، ثبوت اور گواہ پیش کیے گئے۔ محتسم کو اندازہ ہو چلا تھا کہ معاملہ اب اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور یقیناً دوسری پارٹی نے اپنی طاقت دکھا دی ہے۔ کافی دیر یہ سارا سسٹم چلتا رہا اور پھر کچھ جعلی ثبوتوں اور گواہوں کی مدد سے مخالف پارٹی کا پلڑہ بھاری ہو گیا اور جج کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔

جج کا فیصلہ سن کر گویا محتسم کے سر پر آسمان ہی گر گیا تھا۔ اس کی ساری زندگی کی جمع پونجی برباد ہو گئی تھی۔ وہ گھر جا کر اپنے بچوں اور بیوی کو کیا منہ دکھاتا یہ سوچ کر ہی اسے رونا آ رہا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا اس وقت پہ جب اس نے عدلیہ پہ بھروسہ کیا تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر سیدھا اپنی زمین کے اس ٹکڑے پہ چلا گیا جو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتانا چاہتا تھا کہ یہاں صرف امیروں کی حکمرانی چلتی ہے یہاں غریب اور لاچار لوگ ہار جاتے ہیں۔ یہ گونگا پاکستان ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی بول نہیں سکتا۔ یہاں رہنے والی عوام گونگی ہے جو ظلم ہوتے دیکھ کر بھی خاموش ہے۔ یہاں سب کچھ صرف اسی کو ملتا ہے جو طاقتور ہے۔ یہاں سب کچھ صرف ان کا ہوتا ہے جو پیسہ دکھاتے ہیں۔ یہاں سب بکاؤ ہے۔ عدالتیں صرف نام کی ہیں وہاں انصاف نہیں ملتا۔ وہاں صرف اثر و رسوخ والوں کی چلتی ہے۔ انصاف تو صرف رب کی ذات ہی دیتی ہے۔

وہ واپس اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر جاتا تو اس سے سوالات ہوتے اس کے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ رات ہونے کو تھی اور وہ وہاں بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ لیکن ہمارے یہاں کے امیر طبقے اور حکومت کو اس سب سے

کوئ ی فرق نہیں پڑ تا۔ انہیں فرق نہیں پڑ تا کہ کوئ ی کیسے زند گی گزار رہا ہے۔ ایک حضرت عمرؓ کا دور تھا جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر چکر لگا کر دیکھتے تھے کہ کہیں کوئ ی بھوکا نا سو رہا ہو اور ایک آج کی حکومت ہے جس کو کسی چیز کی پرواہی نہیں ہے۔ محتسم ہار گیا تھا اور محتسم جیسے ک ئ لوگ ہر روز ہارتے ہیں صرف اس نظام کی وجہ سے۔

رات کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا اور وہ اب تک اپنی محرومیاں پر ماتم کر رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ وہ خود کو پر اعتماد کرنے کی کوشش کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ سہارا تھا اپنے خاندان کا۔ اسے سب کو حوصلہ دینا تھا۔ اسے سب کے سامنے ایسے ٹوٹنا نہیں تھا۔

اس کے گھر میں سب انتظار میں تھے کہ کیا فیصلہ ہو گا۔ جب رات گہری ہونے لگی تو اس کے گھر والوں کی پریشانی بھی بڑھنے لگی۔ انہیں بھی اس بات کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ ضرور فیصلہ ان کے خلاف گیا ہو گا اسی ل ئ ے محتسم اب تک گھر نہیں لوٹا ساتھ ہی یہ پریشانی بھی تھی کہ کہیں وہ اپنے ساتھ کچھ برا نا کر لے۔ کہیں وہ محتسم کو ہمیشہ کے ل ئ ے کھو نا دیں۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھے جب گھر کا دروازہ آہستہ سے کھلا تھا اور وہ اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں رونے کے وجہ سے لال تھیں۔ کچھ بھی پوچھے بغیر گھر والوں کو پتا چل چکا تھا کہ کورٹ کا کیا فیصلہ آیا ہے۔ اس کی بیوی اسے حوصلہ دینے لگی تھی کہ اللہ سے ناامید نہیں ہوتے۔ جو آج ہم سے چھن گیا ہے وہ کل کو ہمیں دگنی صورت میں واپس مل جائے گا۔ شائ د اسی میں ہمارے ل ئ ے بہتری ہو۔ اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ اپنی بیوی کی باتیں سن کر اسے بہت حوصلہ ہوا تھا۔ اور وہ کہہ بھی تو صحیح رہی تھی جو حق حلال کی کمائ ی ہو وہ کبھی ضائ ع نہیں ہوتی۔

وہ لوگ سب معاملہ اللہ کے سپرد کر کے بیٹھ گئے تھے۔ انہیں امید تھی اللہ سے کہ وہ ان کی ضرور سنے گا ضرور ان کی مدد کرے گا۔

محتسم اور اس جیسے کتنے ہی لوگ اس مشکل سے گزرتے ہیں اور پھر اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ کب تک پاکستان میں یہ سب چلتا رہے گا؟ کب تک غریبوں کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا رہے گا؟ کب طاقتور طبقہ اپنی طاقت اور اپنا بڑا ہونے کا دھونس جمانا بند کرے گا؟ یہ ہمارا پاکستان ہے ہم سب کا پاکستان ہے۔ جس میں سب کو آزادی کے ساتھ جینے کا پورا حق ہے۔ جس میں سب کو ایک جیسا مقام حاصل ہے۔ حکومت کو یہ امیر اور غریب میں فرق ختم کر دینا چاہ ئ ے۔ امیروں اور غریبوں کے حقوق ایک جیسے ہونے چاہ ئ ے دونوں کو انصاف ملنا چاہ ئ ے۔

خاموشی کی بازگشت - گونگے پاکستان کی کہانی رحمت عزیز خان چترالی

ہندوکش کے کے برف پوش اور بلندوبالا پہاڑوں کے دامن میں واقع چترال کی خوبصورت وادیاں، جو کہ اپنی قدرتی مناظر کی وجہ سے مشہور ہیں، ان وادیوں میں سے ایک وادی کھوت میں عزیر احمد اور اس کے دانشمند دادا، دور خان رہتے تھے۔ اس دن ہوا نہایت خوشگوار تھی اور اپنے ساتھ فطرت کی خوبصورت دھنیں بھی لا رہی تھی۔ لیکن اس خوبصورتی کے درمیان، ان دونوں کے ذہنوں پر ایک ناقابل بیان موضوع بہت وزنی تھا- "گونگا پاکستان"۔

ایک پُرسکون دوپہر کو، عزیر اپنے دادا دور خان کے پاس پرانے سفیدے کے درخت کے نیچے بیٹھا وادی کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آخر کار خاموشی توڑنے سے پہلے وہ کچھ دیر کے لیے ہچکچایا اور پھر ہمت کر کے یوں گویا ہوا "داداجان، کیا آپ نے کبھی ہمارے ملک میں بہرے لوگوں کی زندگیوں کے بارے میں سوچا ہے؟"

دور خان نے اپنی حکمت سے بھری آنکھوں سے عزیر کو دیکھا اور سر ہلا کر جواب دیا، "بے شک، میرے پیارے عزیر۔ ہمارے ارد گرد کی دنیا ان لوگوں کے لیے ایک چیلنجنگ جگہ ہو سکتی ہے جو ہماری آوازیں نہیں سن سکتے۔"

عزیر آگے کی طرف جھک گیا، اس کا تجسس مزید بڑھ گیا، "داداجان، مجھے بتائیں۔ پاکستان میں بہرے لوگوں کے لیے زندگی گزارنا کیسا ہے؟ وہ کیسے بات چیت کرتے ہیں، اور انہیں آجکل پاکستان میں کن کن رکاوٹوں کا سامنا ہے؟"

دور خان مسکرایا، اس کی پیشانی کی جھریاں مزید گہری ہوتی جا رہی تھیں، "اچھا، میرے بچے، 'گونگے پاکستان' کی کہانی لچک اور عزم کی کہانی ہے، جس طرح دریا پہاڑوں میں سے اپنے راستے تراشتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، ان لوگوں نے زندگی میں سفر کرنے کے منفرد طریقے تلاش کیے ہیں۔"

"تصور کریں،" اس نے اپنی بات جاری رکھی، "یہ خوبصورت برف پوش اور سنگلاخ پہاڑ گونگے لوگوں کے لیے اتنے خوبصورت ہیں جتنے ہمارے لیے ہیں، ہماری آوازیں ان پہاڑوں سے بازگشت کرتی ہوئی واپس ہمیں سنائی دیتی ہیں۔ اور گونگے لوگوں کے لیے یہ پہاڑ تو بظاہر خاموشی سے کھڑے نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ پہاڑ ان کے لیے، اور ان کی دنیا کے لیے ایک بصری خوبصورتی ہیں۔ وہ اشاروں کی زبان کے ذریعے بات چیت کرتے ہیں، انگلیوں کا ایک ایسا رقص جو جسم

میں بولتا ہے۔ دوسرے، تنہائی کے احساسات کا باعث بنتے ہیں۔"

عزیر دادا کے مزید قریب ہو کر جھک گیا، اور سمجھنے کے لیے بے چین ہوا، "کیا کوئی امید ہے دادا جان؟ کیا وہ ان چیلنجوں پر قابو پا سکتے ہیں؟"

دور خان کی آنکھیں چمک اٹھیں، "آہ، "امید" ایک ابدی شعلہ ہے، میرے عزیز۔ تنظیمیں اور افراد گونگے پن کے بارے میں شعور بیدار کرنے اور اشاروں کی زبان کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے انتھک کام کر رہے ہیں۔

"ایک دفعہ،" دور خان نے پہلے بھی کہا تھا، کہ "ایک بار آمنہ نام کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس کا تعلق لاہور سے تھا اور وہ آرٹ کی تعلیم کے بارے میں نہایت پرجوش تھی۔ اگرچہ وہ سن نہیں پاتی تھی، لیکن اس کے ہاتھ اپنے خیالات کو کینوس پر رنگنے کے ساتھ ساتھ اس کے فن کے ذریعے حرکت کرتے تھے۔ اس نے دنیا سے جڑنے اور دوسروں کو متاثر کرنے کا ایک طریقہ تلاش کیا تھا۔"

عزیر نے سر ہلایا، کہانی سن کر اس کا دل جھوم گیا، "اور ان کے تعلیم کا کیا ہوگا دادا جان؟ کیا گونگے بچوں کے لیے سیکھنے کے مواقع ہیں؟"

دور خان کی مسکراہٹ پھیل اس کے ہونٹوں میں گئی، "در حقیقت، میرے بچے۔ وہ ایک ایسے اسکول میں پڑھ رہے ہیں جو گونگے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے وقف ہیں۔ یہ اسکول اشاروں کی زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ان گونگے نوجوان ذہنوں کو وہ تعلیم ملے جس کے وہ مستحق ہیں۔ چیلنجز حقیقی ہیں، لیکن ثابت قدمی سے معلمین اور طالب علم اور بھی مضبوط ہیں۔"

عزیر کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، "یہ ناقابل یقین ہے دادا جان۔ ہم اس مقصد میں کس طرح اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں، تاکہ ایک مزید جامع معاشرے کی تعمیر میں مدد ملے؟"

دور خان نے عزیر کے کندھے پر ہاتھ رکھا، "ہمدردی سے"، میرے عزیز۔ ہمدردی وہ مضبوط پل ہے جو ہم سب کو آپس میں جوڑتا ہے۔ ہم خود اشاروں کی زبان سیکھ کر، گونگے برادری کے ساتھ ان کی شرائط پر بات چیت کرنے کی کوشش کر کے شروع کر سکتے ہیں۔ ہم ان کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں، جس سے تفہیم اور قبولیت کا اثر پیدا ہوتا ہے۔"

جیسے ہی سورج افق کے نیچے ڈوب گیا، عزیر نے مقصد کا ایک نیا احساس محسوس کیا۔ اس نے اپنے دادا کی

طرف تشکر کے ساتھ دیکھا، "دادا جان، اس کہانی کو شیئر کرنے کے لیے آپ کا شکریہ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس علم کو آگے لے کر چلوں گا، تبدیلی کا حامی بننے کا آپ کا شکریہ۔"

دور خان کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں، "تم پاکستان کا مستقبل ہو عزیر، یاد رکھو، ایک پاکستانی قوم کی اصل خوبصورتی اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنے سب سے زیادہ کمزور شہریوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ ہم مل کر پاکستان کو ایک ایسا ملک بنا سکتے ہیں جہاں گونگے لوگوں کی بھی شراکت ہو۔ اور ہماری اور ان کی دونوں کی گفتگو اتحاد و اتفاق کی ہم آہنگ دھنوں میں بدل جائے۔"

اور اس طرح، چترال کے ستاروں کے آسمان کے نیچے، عزیر اور اس کے دادا نے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور افہام و تفہیم کا ایک یادگار لمحہ شیئر کیا۔ انہوں نے گونگے لوگوں کے درمیان فاصلہ ختم کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا تھا، تاکہ شمولیت کی ایک ایسی کہانی بنائی جائے جو پاکستان کی وادیوں اور پہاڑوں میں بھی گونجتے ہوئے سنائی دے۔

گونگا پاکستان.

بنت احمد۔ کراچی

"میں ایک ماں ہوں اپنی فریاد کس سے کہوں! کس عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاوں! کوئ میری فریاد سننے کے لئے تیار نہیں، میری بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا میری ایک بیٹی "گونگی" ہو گئ ہے صدمہ سے، اس سے سوتیلے پن کا سلوک کیا گیا ہے۔

مجھے بنانے میں سب سے بڑی قربانی میری اسی بیٹی نے دی ہے مگر اسکو بلکل نظر انداز کر دیا ہے وہ بلکل چپ ہو گئ ہے دوسرے اس پر مسلط ہیں اسکو بلکل دبا دیا ہے کوئ اسکا نام بھی لیتا ہے تو مذاق اڑاتے ہیں اسکا نام سننا گوارہ نہیں وہ احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے کوئ ہے جو اسکی گویائی واپس لے ائے؟ اسکی پہچان واپس کر دے، اسکی قوت اور اھمیت کو واپس لے آئے یہ کام تو حکومت کر سکتی ہے مگر حکومت نے ہی تو اسکو اس حال تک پہنچایا ہے کس سے فریاد کروں۔۔

چلیں آپ کو اپنی کہانی سناتی ہوں ایک ماں کی فریاد "میں پاکستان ہوں" سوہنی دھرتی سر سبز شاداب جسکی شناخت میری یہ اولاد "اُردو" ہے جس نے میری تخلیق کے لئے، مجھے بنانے کے لیے، مجھے سنوارنے کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا

بلکہ اسنے ہی قربانی دی آج اسکو مجھ سے جدا کر دیا گیا ہے کہتے ہیں "ھمیں ترقی کرنی ہے تو اردو کو چھوڑنا پڑے گا"

میں نے اپنی اردو کی ڈائری پڑھی میرا دل کٹ گیا کسطرح وہ ٹرپ کر اپنی ناقدری کا گلہ کر رہی ہے کسطرح فریاد کر رہی ہے کیسے ہر جگہ اس کو بے دردی سے الگ کر دیا گیا کیا یہ ہی اسکی قربانیوں کا صلہ ہے چلیں آپ خود پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ اسکی فریاد صحیح ہے۔

میں ستم رسیدہ "اردو" ہوں جسے سب نے چھوڑ دیا ہے دُنیا والوں سے کیا گلہ کریں دینی کاموں کی ضرورت پر بھی مجھے نظر انداز کیا جا رہا ہے میری ایک دوست بڑی پریشان تھی پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کے والد حج کی درخواست جمع کروانے گئے وہ درخواست رد کر دی گئ کہ "اردو" میں نہیں چاہے انگریزی میں لکھ کر لائیں اب میرے ابو کو انگلش نہیں آتی اور مجھے بھی نہیں آتی کی کہ انگریزی میں لکھ سکوں بہت سے لوگوں کے پاس گئے کسی کے پاس ٹائم نہیں ہے پھر کسی نے مشورہ دیا کہ "کمپیوٹر" پر ٹائپ کر والو وہاں پیسے خرچ کر کے درخواست لکھوائی اور اب جمع کروائیں گے وہ انتہائی افسردہ تھی کہ حج کے فارم بھی اردو میں نہیں ھماری تو قومی زبان ہی اردو ہے "انگلش" سب کو تو نہیں آتی کیا بولتی رونے کا دل کر رہا تھا اور اپنی اس "عزت افزائی" پر چپ تھی۔

میری ایک عزیزہ کا بیٹا بہت بیمار ہو گیا تو اسکول سے چھٹی لینے۔ کے لئے درخواست دی تو کہا گیا کہ اردو میں نہیں لکھیں یہ قابلِ قبول نہیں انگلش میں لکھ کر دیں انہوں نے کہا کہ مجھے

نہیں آتی تو بڑی بے نیازی جواب دیا کوئی تو پڑھا لکھا ہو گا یا سب جاھل ہیں "کسی سے بھی لکھوا کر لے آئیں اگر ایک ہفتہ سے زیادہ چھٹی بغیر درخواست کے ہو گئی تو اسکول سے نکال دیں گے اب ایک تو بچے کی بیماری پھر اتنی مہنگی فیس دیکر داخلہ ہوا اتنی مشکل سے بتہ نہیں کسطرح درخواست لکھوا کر دی درخواست تو میں تمھارے سامنے کہہ رہی ہوں ورنہ تو "ایپلیکیشن" کہو نہیں تو جہالت کا طعنہ مطلب اردو میں بات کرنے والا جاھل ہے۔ کیا کہتی اپنی ناقدری کا گلہ کس سے کروں سب ہی وار کر رہے ہیں۔۔۔

ایک اور ماں کی فریاد میری بچی گورمنٹ اسکول میں پڑھتی ہے "اردو میڈیم" تو جب بھی کہیں جانا ہو رشتہ داروں میں، کسی تقریب میں کہیں بھی تو ھم عمر رشتہ داروں کے بچے (آج کی زبان میں کزن) آپس میں ملتے ہیں سوالات کرتے ہیں ایک دوسرے کے بارے میں کون سی کلاس میں ہو! کس اسکول اسطرح کے سوالات کے بعد جب پتہ چلتا ہے کہ میری بچی گورمنٹ اسکول میں ہے تو ہے سب ایسی ترس کھانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں گویا کوئی "جرم" ہو گیا باقائدہ اظہار ہمدردی کیا جاتا ہے ارے! تمھیں تو صرف اردو بولنی آتی ہو گی! تمھیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے "ارے ہائے بے چاری! اسطرح کی باتیں ہوتی ہیں اور بچی احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے، کوئی بتلاؤ کہ ھم بتلائیں کیا۔۔

۔۔۔۔۔۔اردو زباں میں ہے گھلی شہد کی مٹھاس۔۔

۔۔۔۔۔۔لہجہ بھی مہربان ہے اردو زبان کا۔۔۔

سرکاری دفاتر کے لئے انٹرویو ہو یا پرائیوٹ دفتر میں جانا ہو اردو کو تو کوئی جانتا ہی نہیں سارے کاغذاتِ آنگلش میں انٹرویو کے لئے درخواست دینی ہو غرض کہ لگتا ہی نہیں کہ اُردو ھماری قومی زبان ہے جب تک اردو زبان میں انگلش کا تڑکا نہ لگایا جائے اسکا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اگر غیروں کی زبان میں لفظ غلط ہو جائیں تو پھر تو اسکا کیا حشر ہوتا ہے مت پوچھیں اور یہ ہی لوگ اردو کو جسطرح بگاڑ کر بولتے ہیں دوسروں کی نقالی میں۔ "غلط کو "گلت" "خیال" کھیال' اور بہت کچھ میرے بارے میں تبصرے کرتے ہیں اور میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں۔۔

۔۔۔ سینکڑوں اور بھی دنیا میں زبانیں ہیں مگر۔۔

۔۔۔۔۔جس پہ مرتی ہے فصاحت وہ زباں اردو ہے۔۔

بہت دکھ بھری داستان ہے "کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں" میں کبھی سو بھی نہیں سکتی کہ میں جو "قومی زبان" ہوں اس کے ساتھ یہ سلوک ہو گا جو پہچان تھی میرے دیس کی اسکو پرایا کر دیا میں کیا بتاؤں جب میرے سامنے ہی میر اںذاق اڑایا جاتا ہے مجھے گھٹیا سمجھا جاتا ہے جو مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کو دقیانوسی، زمانے سے پیچھے چلنے والا اور پتہ نہیں کیا کچھ کہا جاتا ہے اور یہ چیز تو اب دفتروں، اسکولوں، کالج، سرکاری عمارتوں سے نکل کر گھروں میں بھی زہر بنکر رگ رگ میں اتر گئی ہے۔۔

میری عزت ختم ہو گئی ہے میری زبان ہی بگاڑ دی ہے

بچے، بڑے، جوان عورتیں سب نے میرا حلیہ بگاڑ دیا ہے کوئی

مجھے سننے اور سمجھنے کے لئے کوئی تیار نہیں سب مجھے بھول کر

غیروں کے طریقے پر چل رہے ہیں مجھ سے تو سب ایسے نظر

انداز کرتے ہیں جیسے مجھے جانتے ہی نہیں اور کہیں کوئی اردو کے

الفاظ غلطی سے بھی استعمال کر لیں تو ایسے شرمندہ ہوتے ہیں گویا

کوئی جرم کر لیا ہو۔

مزید کیا اپنی داستان غم سناؤں اپنی ناقدری پر دل کڑھتا ہے

"شادی کارڈ" سے بھی مجھے باھر نکال دیا کوئی اگر اردو میں

چھپوانے کا نام بھی لے تو اسکو "پینڈو" جاھل اور پتہ نہیں کن کن

القابات سے نوازا جاتا ہے۔

مجھے تو آنے والے وقت سے خوف آرہا ہے کہ ھماری تو نسلیں

مجھے پہچانیں گیں نہیں ان کو تو میرے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں

ہو گا آج ھم جسے ترقی سمجھ رہے ہیں ھماری کوئی شناخت نہیں

رہے گی ہر ملک اپنی زبان پر فخر کرتا ہے چائنہ کو دیکھ لیں چین

ہے سعودیہ ہے یہ کسی احساس کمتری کا شکار نہیں ہیں ھمیں پتہ

نہیں کس راستے پر ڈال دیا ہے اور کوئی بھی اسکی تباہی کو محسوس

نہیں کر رہا کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ جب بھی کسی چیز کی قدر

نہیں کی جاتی اس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔

سب مگن ہیں ایک بھیڑ چال ہے بس اب ھمت نہیں اللہ تعالیٰ

میری اور میری نسلوں کی اور میرے وطن کی حفاظت کرے اور

یہ میری طرح گمنام نہ ہو جائیں اللہ کرے میرا درد سب کے دل

میں اتر جائے۔۔

۔۔۔۔"اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔۔۔

کیوں جان حزیں خطرہ موہوم سے نکلے۔۔

کیوں نالہ حسرت دل مغموم سے نکلے۔۔

آنسو نہ کسی دیدہ مظلوم سے نکلے۔۔

کہہ دو کہ نہ شکوہ لب مفہوم سے نکلے۔۔۔

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔۔۔

اردو کا غم سبک بھی ہے گراں بھی۔۔

ہے شامل ارباب جہاں شاہ عزاں بھی۔۔

مٹنے کو ہے اسلاف کی عظمت کا نشان بھی۔۔

یہ میت غم دہلی مرحوم سے نکلے۔۔۔

اردو کا جنازہ ہے ذرا۔ دھوم سے نکلے۔۔۔

سایہ ہو تو اردو کے جنازے پہ ولی کا۔۔

ہوں میر تقی اور ساتھ ہوں سودا۔۔

دفنائیں اسے مصحفی ناسخ وانشا۔۔

یہ فال ہر ایک دفتر مظلوم سے نکلے۔۔

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

گونگا پاکستان

طوبیٰ نور خانم (سانگھڑ، سندھ)

اگر آپکو پتہ چلے کے "آپکو بولنے کا حق نہیں ہے"؛ "آپکی قوت گویائی چھینی جارہی ہے"؛ یا "آپکی زبان کاٹ دی جائیگی" اور "آپ گونگی ہو جائیں گے" تو کیسا محسوس ہوگا؟ جان نکلتی ہوئی محسوس ہو گی ناں؟

میرے لئے بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے یہ سب؛ کہ کوئی میرے پاک وطن، مملکت خداداد، میرے پیارے پاکستان سے اسکی سرکاری زبان چھیننے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ میرے پاکستان کی زبان چھیننے والا اور کوئی نہیں بلکہ خود پاکستان کے باشندے، نام نہاد پاکستانی، انگریزی زبان کے شیدائی اور انگریزوں کے غلام ہیں۔ کیوں میرے وطن سے اسکی سرکاری زبان چھینی جارہی ہے؟ جب کہ پاکستان کی سرکاری زبان ہونے کے ناطے، پورے ملک میں اردو زبان نافذ کر کے اردو کو آفیشل زبان بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے تو پھر اردو کے ساتھ غیروں جیسا رویہ کیوں؟ جب ہر ملک میں اسکی سرکاری زبان بولی، پڑھائی اور لکھائی اسی ملک کی سرکاری زبان میں کی جاتی ہے۔ تو پھر پاکستان میں اردو زبان کیوں نہیں؟ کیوں بغض ہے اتنا اردو سے؟ کیوں اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں سے اردو کا رجحان ختم کیا جارہا ہے؟

فیس بک کی کسی پوسٹ پر تحریک نفاذ اردو پاکستان کے لئے نہ جانے کتنی دیر تک بحث کرتے کرتے سوگئی تھی۔ رات کے نہ جانے کونسے پہر اسکی آنکھ کھلی؟ تو اپنے سیاہ دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی اٹھی فون کافی دیر سے بج رہا تھا وہ آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھی اور دیکھا تو حیران رہ گئی اسکے مکتب کی ایک ہم جماعت ندا کا فون تھا۔ وہ اسے کسی نفاذ اردو پاکستان کے لئے بنائی گئی کسی تحریک کا بتا رہی تھی، کہ "یہاں نفاذ اردو کے لئے کچھ لکھاریوں کی ضرورت ہے"، اس نے "اردو" کا نام سنتے ہی شمولیت کے لئے حامی بھر لی کہ "اپنی سرکاری زبان کے نفاذ کے لئے تو اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہوں میں" اسی دوران اس نے ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ "کوئی افسانہ نگاری کا مقابلے کا انعقاد کیا جارہا ہے تمہیں بھی اس مقابلے لازمی شمولیت اختیار کرنی چاہیے"۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے اپنی دوست کو خدا حافظ کرتے ہوئے اس اس نے نفاذ اردو کی تحریک اور اس مقابلے میں شمولیت کا پختہ عہد کر لیا۔ اور اسی وقت لکھنا شروع کر دیا۔

اسے اردو زبان سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ اس نے لکھنا شروع کیا؛ لکھتے لکھتے یہ بھی لکھا کہ "اردو کو اس کے اصل وطن سے دور کرنے کا سوچنا بھی گناہ لگ رہا تھا. لوگ نہ جانے کیسے یہ ظلم کر رہے ہیں؟ "نہ جانے کیوں اردو کے قاتل بننے اور پاکستان کو گونگا بنانے پر تلے ہوئے ہیں"؟ اس نے سو ہزار لفظوں کا افسانہ لکھنا شروع کیا، دل کی سب بھڑاس، دکھ، اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی تکلیف صفحہ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دی۔ اور یہ بھی لکھا کہ اردو اس نے بہت اچھا لکھا اردو کوئی آج کی زبان نہیں ہے اردو برصغیر سے پاکستان کے ساتھ ہجرت کر کے آئی ہے ہم کیسے اردو کو جلاوطن کر سکتے ہیں۔ کچھ خیالات کو صفحات پر سجا کر وہ پھر سے سونے کے لئے لیٹ گئی۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

****

صبح اٹھ کر ناشتے کے فوراً بعد اس نے پھر سے لکھنا شروع کر دیا۔

پاکستانی اردو نشریات، تعلیم اور سرکاری مواصلات میں انگریزی کے غلبے جیسے مسائل کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہے۔ نوجوان نسل اسے کم استعمال کر رہی ہے اور اس کے نتیجے میں اسے استعمال کرنے میں پختگی اور استواری نہیں۔ مقامی بولی جانے والی زبانوں اور لہجوں کی اہمیت میں بھی کمی نہیں آئی جس سے اردو کی مجموعی اہمیت مزید کم ہو سکتی ہے۔ ایک زبان اور ثقافت کے طور پر اردو کی مطابقت کو اب بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔ تعلیمی نظام ان درسگاہوں کی بھرپور حمایت کرتا ہے جہاں طلباء کے لیے انگریزی تعلیم کی بنیادی زبان ہے۔ اردو میں کم ہوتی مہارت اور تعلیمی مہارت اسی عادت کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر کم کیا گیا ہے۔ طالب علموں کو اکثر اردو میں واضح بات چیت کرنے میں دشواری ہوتی ہے، جس سے زبان ختم ہو جاتی ہے۔ انگریزی اور مقامی زبانوں کا مرکب پاکستان میں میڈیا کے ماحول پر حاوی ہے۔ اس ترجیح کے نتیجے میں مقبول ٹیلیویژن پر نشر ہونے والے پروگرام میں اردو کا استعمال کم ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ثقافتی کہانیوں اور عوامی مباحثوں پر اثر انداز ہونے کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ اردو کا رجحان بڑھانے کے لیے، خصوصی نشستیں بٹھائی جائیں اور اردو کو فروغ دیا جائے۔

پاکستان میں بڑی تعداد میں مقامی زبانیں ہیں جو پورے ملک میں بولی جاتی ہیں۔ کچھ علاقے اپنی مقامی زبانوں کو اردو پر اہمیت دیتے ہیں، اور یہ زبانیں اکثر قریبی ثقافتی اور جذباتی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ زبان کی شناخت وسیع ہو جائے اور اردو پر کم توجہ دی جائے۔ ان مشکلات کے باوجود اردو کے فروغ اور تحفظ کے لیے مسلسل کوششیں کی

جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، پاکستان کی سرکاری زبان کے محافظ مختلف شعبوں میں اردو کے استعمال کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی ایک بڑی تعداد اردو کو ختم کرنے کی تنظیموں کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری، ادب اور تاریخ کی اہمیت پر کئی ثقافتی اور ادبی تنظیمیں مزید زور دیتی ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ انگریزی زبان کو فروغ دیا جارہا ہے۔ جو کہ سراسر ظلم ہے پاکستان کی سرکاری زبان کے ساتھ

یہ سب لکھنے بعد وہ کچن میں گئی اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ کھانا بناتے وقت بھی ذہن میں اردو نامہ ہی گھوم رہا تھا کہ کیسے اپنے وطن کو گونگا ہونے سے بچایا جاسکے ؟

کیسے پاکستان کی زبان کو پاک رہنے دیا جاسکے گا؟

فریج سے مرغی اور سبز مصالحہ نکالتے وقت اسکا ذہن اس سبز رنگت میں کھو گیا وہ پاکستان کے سب سے پہلے جھنڈے کو سوچنے لگی "کیسے اسکا ڈیزائن بنایا گیا ہوگا" فوراً سے اس خیال کو جھٹکتی وہ فریج بند کر کے مرغی صاف کرنے لگی اور مرغی پہ لگے خون کو دیکھ کر "وہ لاشے وہ قربانیاں یاد آگئیں جو پاکستان کے قیام کی راہ میں دی گئی تھیں" اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے وہ خود کو سنبھالتی جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی اور کچھ ہی دیر میں سالن چڑھانے کے لئے سامان تیار تھا۔ چولہا جلا کر پتیلی رکھ کر بھی ڈالتے ہوئے بھی اسی بارے میں سوچتی رہی کہ "کس لئے پاکستان کا نظریہ پیش کیا تھا علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے"؟

کیوں دیا پیش کیا گیا تھا نظریہ پاکستان؟

کیا انگریز وجہ نہیں تھے برصغیر کی تقسیم کے؟

کیا ہمیں انگریزوں کی زبان اور ان کی ثقافت کو فروغ دینا چاہیئے؟

کیا ہم پاکستانی کہلانے کے لائق ہیں؟

افففففففففف۔۔۔۔۔۔۔۔!!

اسکا ہاتھ گرم پتیلی چھوا تھا جس کے باعث اسکو بہت تکلیف ہوئی تھی۔ سوچنے لگی اگر آج قائدِاعظم محمد علی جناح ہوتے، تو انہیں بھی اردو کے ساتھ بے اعتنائی پر شاہد اتنی ہی تکلیف ہوتی۔ خیالات کو جھٹکتے سالن بھون کر دیگچی اتار کر پھر خیالات میں گم ہوگئی۔ پھر توا چولہے پر رکھ کر پیڑے بنانے لگی اور جلدی جلدی روٹیاں بنا کر وہ باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔

امی کو کھانا بن جانے کی اطلاع دیکر ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہوئی اور دسترخوان لگا کر سب کے ساتھ خاموشی سے کھانا کھانے کے بعد برتن سمیٹنے لگی۔ باورچی خانے میں جا کر برتن دھوتے وقت پھر اردو کے ساتھ ہوتی ہوئی ناانصافی ذہن میں گردش کرنے لگی۔ وہ پھر منٹو پارک میں ہوئے اس تاریخی

جلسے میں جا پہنچی جہاں پاکستان کے قیام کی منظوری دی جا رہی تھی۔ کیا اسی دن کے لئے کیا گیا تھا سب؟ "انگریزوں سے آزادی مل جائے گی مگر انگریزی سے نہیں" وہ اللہ کریم سے دعا کرنے لگی "خدارا میرے ملک و قوم کی حفاظت فرما" اور پھر کنے لگی, اے خدایا!"میری اردو کی خیر فرما"۔ دل ہی دل میں دعا مانگ کر آمین کرتی؛ وہ کچھ پر سکون ہوئی تھی۔ پھر قلم اور کاغذ سنبھال کر لکھنے بیٹھ گئی۔ ایک جگہ پہنچ کر اسے داغ دہلوی کا وہ شعر یاد آگیا.

اردو جسکا نام اسے جانتے ہیں داغ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

وہ اس شعر پر نہ رکی بلکہ اردو کی محبت میں اپنے قلم سے اشعار بکھیرنے لگی۔

اے اردو میری میٹھی زباں

تو شیریں ہے تو سادہ سی

تیری سانسیں بچانے کی خاطر

ہم حکومت سے لڑ جائیں گے

تیرا سکہ پھر سے چلائیں گے

تیرے چرچے گھر گھر گائیں گے

میری سانجھی، ساتھی، ہمجولی

تو شیریں ہے تو سادہ سی

وہ یہ سب لکھ کر قلم اور کاغذ سمیٹ کر رکھتی آرام کرنے کو لیٹ گئی۔

اس نے افسانہ مکمل لکھ لیا تھا۔ اب وہ اس افسانے کو تحریک نفاذ اردو پاکستان کی بزم ادب میں بھیج کر، پر سکون سی ہو گئی تھی۔

وہ پھر سے فیس بک چلا کر پھر سے بحث و مباحثے میں مشغول ہو گئی۔ دو دن بعد اس مقابلے کا نتیجہ آنا تھا، وہ چاہتی تھی "اسے کوئی درجہ ملے نہ ملے مگر اس کے الفاظ کو سراہا جائے" وہی ہوا جب نتیجہ آیا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس کی لکھے ہوئے افسانے کو تمام لکھاریوں کے مقابلے میں "اول درجہ" ملا۔ اور اسے۔ سراہا بھی گیا اور شیلڈ اور اعزازی سند دی گئی۔ وہ خوشی سے سرشار تھی اسے اپنی منزل قریب محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ اسکی اردو زبان کو نفاذ کا پروانہ مل گیا، یہ پہلا قدم تھا اسکا دل خوشی سے شاد باد ہو گیا۔

گونگا پاکستان

نام: علینہ شاہ

آزادی، آزادی آزادی۔۔۔۔

وہ ۱۴ اگست کے دن ہاتھ میں جھنڈا پکڑے لہرایا کرتا آزادی کے نعرے لگاتا گلیوں میں پھرا کرتا تھا۔ آخر کار ابا اس کو پکڑ کر گھر لاتے اور کہتے

رشید پتر! بس کر دے تھک جائے گا۔

ابا آپ بھی آزادی کا نعرہ لگایا کرتے تھے نا۔۔۔ وہ جوش جذبات سے کہتا ان کے پیروں میں بیٹھ جاتا۔

ہاں پتر ہم بھی گلیوں گلیوں آزادی کا نعرہ لگاتے پھرا کرتے تھے۔ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔

اکثر قیامتیں زمین زادوں پر بھی برپا ہوتی ہیں جب بے حسی چاروں طرف پھیل جائے، جب زمین مظلوم کے خون سے رنگی جائے اور ماؤں کے کلیجے ابل کر باہر آجائے تو اکثر قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ اس دن اپنا گھر بار چھوڑ کر بے سر و سامانی کی حالت میں اماں، ابا اور بہن بھائیوں کے ساتھ چھپتے چھپاتے گھر سے نکلے تھے، جگہ جگہ کٹی پھٹی لاشیں پڑی تھیں ۔عورتوں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا۔۔۔ آہ!!.! وہ دن بھی کیا بھیانک دن تھا۔ بات کرتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ انہوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو اس کے آگے پھیلایا۔۔ راستے میں مرنے والے اپنے بہن بھائی کو ان ہاتھوں سے مٹی کھود کر دفنایا تھا۔ ان کے رونے سے اس کے نعروں میں شدت آجاتی۔

ابا کے کانپتے ہاتھوں اور ہونٹوں کے ساتھ آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس کے جذبات میں ہلچل مچا دیتی اور آزادی کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔

اس دن بھی ایک شام اتری تھی پیڑوں پر، دیواروں پر، چھتوں پر، دریاؤں کے بہتے پانیوں پر اور پہاڑوں کی اوٹ میں چھپتا سورج یہ سب دیکھتا ہوا چھپتا چلا گیا۔ ازل سے سورج کا یہ کام اسے تفویض کر دیا گیا تھا اور اس سے وہ روگردانی کرنے کی جرات نہیں رکھتا تھا۔ اس عام شام میں جو ہوا وہ عام نہیں تھا۔

میر عاصم علاقے کا بڑا جاگیر دار تھا بظاہر ہاتھ میں تسبیح پکڑے رکھتا اور سر پر ٹوپی جمائے ہوئے وہ نیک انسان تھا۔

اس شام وہ بازار سے واپس لوٹ رہا تھا، راستے میں پرانے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے قریب پہنچا تو عجیب سی آوازیں سنیں۔ وہ پل بھر میں رک گیا اور پھر اس نے جو دیکھا اور سنا وہ اس کے کمزور اور نرم دل کے لئے ناقابل برداشت تھا

۔میر عاصم کا وہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا۔وہ درندہ بنا اس لڑکے کے سامنے کھڑا تھا۔میر عاصم نے اس اسد نامی لڑکے کو مار ڈالا۔اس کا قصور اتنا نہیں تھا لیکن ظالم کب قصور دیکھتا ہے اس کا کام ظلم کرنا ہوتا ہے۔اسد نامی لڑکے کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جس میں میر عاصم خلاف ثبوت تھے ،دھوکہ دہی کے ثبوت،ناجائز،غیر قانونی کام کاموں کے ثبوت اور بدعنوانی کے ثبوت۔۔۔۔اور میر عاصم کو یہ کسی صورت گوارا نہیں تھا کہ اس کا خوبصورت نقاب کے پیچھے چھپا اس کا مکروہ چہرہ سب کے سامنے آئے۔پھر وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے،سچ کو مار کر جھوٹ کا علم بلند کرنے کی کوشش کی گئ۔میر عاصم نے اس کے سامنے اس لڑکے کی گردن کاٹ ڈالی اور وہ لڑکا اور اس کے کاغذات والا ہاتھ بے جان ہوگیا۔رشید کو اپنے جسم سے بھی جان نکلتی محسوس ہوئ خون کی لکیر اس کے چہرے پر پڑی تھی۔رشید اپنی چیخ نہ روک سکا۔وہاں کھڑے سب لوگوں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔اس کے قدموں کی آواز بڑھتی جا رہی تھی۔بھاگتے ہوئے اس نے اپنے چہرے سے خون صاف کیا تو اس کا سرخ چہرہ اور سرخ ہاتھ،اس کے حواس کھو رہے تھے۔وہ گرنے کے قریب تھا کہ راستے میں کھڑی لمبی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔اس کا دل چاہا وہ تمام زندگی ان جھاڑیوں میں بیٹھا رہے جو دو چہرے نہیں رکھتی تھی جو بے قصور کا بے دردی سے خون نہیں بہاتی۔

رشید گھر جا کر ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔

میں لوگوں کو بتاؤں گا تم کیسے آدمی ہو۔اس لڑکے کی آواز بار بار اس کے آس پاس گونج رہی تھی اور پھر وہ دنیا کو بتانے کے لئے زندہ نہیں بچا تھا یا اسے زندہ رہنے نہیں رہنے دیا گیا تھا۔

میرے پاس تمہارے خلاف ثبوت ہیں میں یہ سب لوگوں کو دکھاؤں گا،میں پولیس کو بتاؤں گا کہ تم ایک قاتل ہو تم نے میرے باپ کو مارا میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس لڑکے کے جواب میر عاصم کا زوردار قہقہ گونجا تھا۔تمہارا باپ بھی تمہاری طرح بے وقوف تھا،میں قاتل نہیں بلکہ یہ ایمانداری تم لوگوں کی قاتل ہے۔میر عاصم کے قہقے اس لڑکے کی کٹی گردن۔۔رشید کے جسم کی کپکپاہٹ میں اضافہ ہوا۔

اماں ابا پریشانی سے اس کی حالت دیکھ رہے تھے۔

رشید بتا تو صحیح آخر ہوا کیا ہے؟وہ پوچھ رہے تھے اور وہ بتانے سے قاصر تھا۔

وہ بتانے کے لئے زندہ نہیں رہا میں تو ہوں نا!!! وہ بڑبڑایا۔ ہاں اماں میں زندہ ہوں دیکھیں ابا میں میں زندہ ہوں۔ اچانک وہ چلانے لگا، اپنے بازؤوں اور سر پہ ہاتھ پھیرتا وہ کہتا رہا۔ میں بتاؤں گا لوگوں کو میر عاصم کی اصلیت۔ میں تو زندہ ہوں کیا ہوا اگر وہ لڑکا مارا گیا یا مر گیا۔ میں کمزور پر طاقتور کو قابض ہونے نہیں دوں گا۔

رشید کیا بک رہے ہو؟ ابا کو اس سے خوف محسوس ہوا کسی انہونی کے خیال سے وہ تڑپ اٹھے۔

تجھے خدا کا واسطہ ہے پتر میر عاصم جیسے لوگوں سے دور رہ۔ ابا نے چیخ کر کہا۔ اماں رونے لگیں۔

اگر ابا جانتے ہیں تو سب لوگ جانتے ہوں گے پھر سب خاموش کیوں ہیں؟ وہ سوچنے لگا۔

آخر کیوں ابا؟ میں پولیس کو بتاؤں گا لیکن میں خاموش نہیں رہوں گا۔ آج ایک مرا ہے کل اور بھی مریں گے، میں بھی مروں گا۔

ابا نے زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ مرنے کی بات کرتا ہے کمینے!!!

تو نہیں جانتا پاکستان بننے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اقتدار نے ملک کو اس کے لوگوں کو سوائے محرومی کے کچھ نہیں دیا۔ اقتدار ایک ایسی چھڑی ہے جس کے ہاتھ میں ہو وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر سکتا ہے۔ جانوں سے کھیلنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تیرے جیسے ہزاروں بھی مارے جائیں تو ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔ ابا نے غصے اور اذیت سے کہا۔

میں پولیس کو بتاؤں گا، ایسے لوگوں سے نمٹنا ان کو اچھے سے آتا ہے۔ وہ جوش سے بولا۔

تو سمجھتا کیوں نہیں ہے رشید، جس کے پاس اقتدار ہے پولیس بھی اس کی، نظام بھی اس کا، لوگ بھی اس کے حتی کہ ہماری جانیں بھی۔ ابا کہتے ہوئے رونے لگے اور نڈھال سے وہیں بیٹھ گئے۔

رشید نے بے بسی سے ابا کو دیکھا اور ان کے پیروں کو تھام لیا۔ آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا، ابا میں خاموش رہا تو مر جاؤں گا۔ آزادی کے نعرے کیسے لگاؤں گا، آج ایک گردن کٹتے دیکھی کل نجانے کتنی گردنیں کٹتے دیکھوں گا۔

ابا اور اماں کو روتے دیکھ کر وہ ہارنے لگا۔ ٹھیک ہے ابا جیسا آپ کہیں گے ویسے ہی سب کروں گا، روئیں نہیں۔ وہ ابا اور اماں کو روتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ابا نے خوش ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔

اب وہ خاموش ابا اور اماں کے پاس بیٹھا تھا۔ کھانا اس سے کھایا نہیں گیا اور نہ کسی نے اصرار کیا۔ اتنی مرضی کرنے کا

اختیار تو حاصل تھا اسے کہ اپنی مرضی سے کھا سکے جب دل نہ ہو تو نہ کھائے۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ تینوں کا دل زور سے دھڑکا۔ اس وقت کون آ گیا؟ دستک کی آواز مسلسل اور تیز تھی۔ ابا چپل پہنتے باہر کی طرف لپکے۔

دروازہ کھولتے ہی تیزی سے چار پانچ پولیس وردی میں ملبوس لوگ اندر آئے۔ رشید کہاں ہے؟

اماں نے اسے ڈر کر تھام لیا جیسے آنچل میں چھپا لینا چاہتی ہوں جیسے دنیا کی ظالم نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتی ہوں۔ ابا گھبرا کر پولیس کے آگے ہوئے، چلے جاؤ یہاں سے میرے پتر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی مت دیکھنا۔

پولیس کے آدمی خباثت سے مسکرائے اور انہیں دھکا دے کر سامنے سے ہٹاتے رشید کی طرف بڑھے۔ اور پھر ہزار واویلے ،منت سماجت پر بھی رشید کو پکڑ کر لے گ ئے۔ جرم نہیں بتایا تھا،اور جرم اکثر گونگے ہو جاتے ہیں جب ہتھکڑیاں پہنانے والوں کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے ہوں جو زبانیں تو کیا سچے دلوں کو بھی جلا دیتے ہیں۔

گھر سے نکلتے سے لے کر گاڑی میں بٹھاتے تک وہ آزادی آزادی کہتا رہا۔۔ آخر کار پولیس والے نے بندوق ک سرا اس کے سر پہ مارا اور گالی دی۔ وہ ہوش کھو بیٹھا۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بدبودار فرش پر لیٹا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک آدمی بیٹھا وہ چالیس کے لگ بھگ تھا کہیں کہیں جھانکتے سفید بال اور درمیانے قد کے ساتھ وہ خستہ حال آدمی تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن پاس نہیں آیا۔

اٹھنے کے ساتھ ہی وہ بلند آواز سے آزادی کہتا رہا، پہرے دار کے خاموش کرانے کے باوجود وہ خاموش نہیں ہوا اسے آزادی چاہیے تھی بے ایمانی سے، بے حسی سے، غاصبوں سے ،ناجائز خون بہانے والے سے اور ان سلاخوں سے۔۔۔

آخر کار پولیس کے آدمی نے دو تین زوردار جھانپڑ رسید کیے ۔وہ مضبوط بنتے بنتے کمزور پڑنے لگا تھا اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ وہ اٹھ سکے۔ ابا اور اماں کے روتے چہرے،۔ آنسوؤں کی لکیریں وہ بھلا نہیں پا رہا تھا۔

آزادی کے لئیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس آدمی نے ہمدردی سے کہا اور کافی دیر سے پڑی ٹھنڈی روٹی اس کی طرف بڑھائی اور کھانے کا کہا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر کھانے لگا کہ اسے آزادی چاہیے تھی جس کے لئے طاقت ضروری تھی ۔

اگلی صبح کا سورج چڑھتے ہی اس نے اماں اور ابا کو جیل کی سلاخیں پکڑے دیکھا۔ ایک رات میں ہی وہ کتنے بوڑھے ہو گ ئے تھے۔ وہ مضبوط بنا ان کے سامنے کھڑا رہا جو ساری

رات روتا رہا اب خاموش تھا۔ اس کے ماں باپ کمزور رشید کو دیکھ کر شاید کھڑے نہ رہ سکتے تھے۔

ابا بد قسمتی سے غلامی کا طوق میرے گلے میں ڈال دیا گیا وہ ان کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا، مجھے معاف کر دینا ابا میں نے آپ کو دکھ دیا لیکن آپ دیکھیئے گا میں اس غلامی سے آزادی ضرور حاصل کروں گا۔

عدالت میں پیشی تھی وہ شدت سے اس وقت کا منتظر تھا جب عدالت میں میر عاصم کا مکروہ چہرہ بے نقاب کرے گا۔ جب غلامی کا طوق اتار پھینکے گا اور آزادی کا جشن منائے گا۔

عدالت میں جاتے ہی اسے جرم بتایا گیا۔ رشید نے اسد نامی لڑکے کو مار ڈالا۔ میر عاصم کا جرم اس پر ڈالا جا رہا تھا کہ اس نے صرف یہ سب کرتے میر عاصم کو دیکھ لیا تھا جو اس کے بارے میں سب جان چکا تھا۔

رشید یہ سب سن کر چیخ اٹھا تھا، قصور وار کو چھوڑ کر بے قصور کو کیوں پکڑتے ہیں؟ میں نے اسے نہیں مارا میرا یقین کرو خون بہا ضرور لیکن میں نے نہیں بہایا۔ میر عاصم اپنے گناہ کو میرے چہرے پر مل کر خود کو بچانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ وہ چیختا رہا چلاتا رہا۔ جس کے نتیجے میں اگلی تاریخ دے دی گئی تھی۔ میر عاصم خباثت سے مسکراتا رہا۔ اسے پھر سے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کا وکیل کمزور تھا کیونکہ وہ خود کمزور تھا۔ ابا روز اس سے جیل میں ملنے آتے تو اس کا ہاتھ پکڑے خاموشی سے کھڑے رہتے اور جاتے وقت یہ ضرور کہتے رشید ہار نا مت! اس غلامی سے آزادی ضرور ملے گی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ غلامی کا طوق جس گلے میں پڑ جائے تو گردنیں کٹ کر ہی اترتا ہے۔

رشید ہارنے لگا تھا، بے ایمانی، بے حسی اور ظلم نام کے تھپیڑے اتنے طاقتور تھے کہ رشید نام کا کمزور پودا کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔

ہر پیشی پر وہ چیخ چیخ کر میر عاصم کا نام لیتا اور خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ ہر بار اس کے خلاف گواہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا۔ وہ حیران ہوتا کہ اس دن اس کے علاوہ ان کھنڈرات میں کیا اتنے آدمی چھپے تھے کہ روز نکل آتے تھے اور یہ سب وہ بھی جانتے تھے جو رشید بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اب بھی آزادی کے نعرے لگاتا تھا یہاں تک کہ نڈھال ہو کر گر جاتا۔

اس دن سورج بادلوں میں چھپا رہا، سخت حبس زدہ دن تھا۔ رشید کی حالت بہت کمزور تھی۔ زندگی نے اس سے وہ امتحان لیا تھا جس کے سوال حل کرتے کرتے اس کا پورا وجود اذیت سے دوچار تھا۔ ابا کے ساتھ اماں بھی آئی تھیں، روتی ہوئی کمزور بوڑھی عورت۔۔۔ یہ اس کی وہ اماں نہیں تھیں جو صحت مند تھیں جن کی ہنسی بہت خوبصورت تھی۔ وہ کمزور عورت اس کے ہاتھ چومتی اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتی

رہی اور روتی رہیں کاش رشید تو اس دن بازار نہ جاتا کاش تو وہاں نہ رکتا۔ میر عاصم خدا تجھے ذلیل و خوار کرے، تو نے میرے بیٹے کا کیا حال کر دیا۔

رشید کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔

ابا نے اماں کو چپ کروایا اور کہا کہ وکیل کہ رہا تھا کہ آج کی پیشی میں رہائی مل جائے گی۔ ابا کا لہجہ ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

وہ خلاف معمول کٹہرے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے میر عاصم بیٹھا تھا وہ اس دن کے بعد آج آیا تھا۔ اماں ابا جج کی طرف امید سے دیکھ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح وکیلوں کی بحث اور گواہوں کی آمد کے بعد تمام تر ثبوت اس کے خلاف تھے۔ اسے اس لڑکے کا قاتل قرار دیا جا رہا تھا جسے وہ جانتا تک نہیں تھا۔ اس کے ایک منٹ کھڑے ہونے کا قصور یہ تھا کہ وہ ساری زندگی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا اب۔۔

آپ کچھ کہنا چاہیں گے ؟جج نے آخر میں اس سے پوچھا۔

میں ؟اس نے حیرانی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ میر اقصور اتنا ہے جج صاحب کہ میں سمجھتا تھا کہ میں آزاد ہوں وہ آزادی جو میرے ابا جیسے ہزاروں لوگوں نے قربانیوں سے حاصل کی تھی۔ میں اس آزادی کے نعرے لگاتا وہاں سے گزرا تھا ،جہاں میر عاصم جیسے حاکم آزادی پر اپنی گھناؤنی حرکتوں سے وہ کالک مل دینا چاہتے ہیں کہ زندگی بھی شرم محسوس کرے ۔میر اقصور صرف اتنا تھا کہ میں وہاں کھڑا ہوا تھا، میر اقصور اتنا کہ مجھے ہر برائی سے، ہر غلط انسان کی غلامی سے آزادی چاہیے تھی، میر اقصور اتنا ہے کہ میں نے میر عاصم کو گناہ کرتے دیکھ لیا تھا جج صاحب !میر اقصور۔۔۔۔۔۔

اس کا سانس پھولنے لگا آواز اس کے حلق میں اٹکنے لگی تو اس نے کٹہرے کی دیواروں کو مضبوطی سے تھام کر خود کو گرنے سے بچانا چاہا۔ لیکن تمام تر کوشش کے باوجود وہ خود کو گرنے سے نہیں بچا سکا سفید دھند اس کو چاروں طرف پھیلتی نظر آئی آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے اماں کی چیخ سنائی دی ۔وہ بتانا چاہتا تھا بہت کچھ لیکن پاکستان کے گونگے قانون نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی تھی، رشید کا ہوش و حواس سے بیگانہ وجود کٹہرے میں پڑا چیخ چیخ کر اندھی اور بے جا طاقت کے اندھے قانون کی کہانی سنا رہا تھا۔

گونگا پاکستان

انیلہ شہباز، چکوال

"السلام علیکم اماں!" تابندہ نے گھر میں داخل ہوتے ساتھ باآواز بلند ساس ماں کو سلام کیا جو بیری کے درخت کے نیچے رکھی چارپائی پہ اونگھ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام پتر۔" سست روی سے جواب دیتے ہوئے ثریا بیگم نے آنکھیں موندلیں۔

تابندہ نے پرس برآمدے میں موجود

اکلوتے صوفہ پہ رکھا، منہ ہاتھ دھو کر کچن کی طرف بڑھ آئی۔ کھانا گرم کر کے کھاتے ہوئے اسے چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ چینخنے اور چلانے کی آواز آنے لگی۔

اس کو نوالہ حلق میں پھنستا محسوس ہوا تو وہ پانی پی کر باہر آ گئی۔

آوازیں دیوار کے اس پار سے آ رہی تھی، جہاں نویدہ حسب معمول اپنے بیٹے معاذ کو ڈانٹ رہی تھی۔

دوپٹے دوست کرتے تابندہ نے بالآخر آج معاملے کی تہہ تک پہنچنے کا ارادہ کیا اور گیٹ عبور کرتے باہر نکل آئی۔

دوازے پہ دستک دینے پہ گیٹ نویدہ کی چھوٹی چھ سالہ بیٹی نے کھولا اور ہشاش بشاش لہجے میں "ہیلو آنٹی۔۔" کہا۔

تابندہ نے سامنے موجود معصوم سی فرشتے صفت بچی کو دیکھا جس کا مغربی طرز کا لباس اس کا تن ڈھانپے میں خاصا ناکام نظر آرہا تھا۔

"امی کہاں ہیں بیٹا؟" ٹھنڈی آہ بھرتے تابندہ نے بچی سے استفسار کیا۔

ہاتھ میں موجود موبائل پہ گیم کھیلتے بچی نے سامنے ہال کی طرف اشارہ کیا اور خود کمرے میں غائب ہو گئی۔

"السلام علیکم خالہ۔۔" چٹائی پہ بیٹھے نو سالہ معاذ نے خاصی روندھی ہوئے آواز میں سر اٹھا کر تابندہ کو سلام کیا تو وہ افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔

"ارے تم کب آئی آو بیٹھو۔۔" غصہ سے معاذ کو گھورتے ہوئے نویدہ نے

تابندہ کو پیش کش کی تو وہ صوفہ نما کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں ڈانٹ رہی تھی معاذ کو؟" تابندہ نویدہ کے پاس بیٹھے ہی شروع ہو چکی تھی۔

نویدہ نے گہرا سانس ہوا میں خارج کیا اور سارا واقعہ پڑوسن کے گوش گزار کرنے لگی۔

٭٭٭٭

گرمی کی تپش آہستہ آہستہ کم ہو رہی۔۔

سادہ سے کاٹن کے سوٹ کے میں مبلوس احمر صاحب ہشاش بشاش سے لیپ ٹاپ پہ کوئی انگلش فلم دیکھنے میں مصروف تھے جب نویدہ چائے لیے چلی آئی۔

"معاذ کو مار کر ہی سمجھانا پڑے گا اب اور کوئی چارہ نہیں" نویدہ نے احمر کو چائے کا کپ تھامتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"پیار سے سمجھائیں بیگم، مان جائے گا۔" احمر نے بیوی کو تحمل سے جواب دیتے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔

"میں تو تھک گئی سمجھا سمجھا کر۔۔" نویدہ نے تھکے تھکے لہجے میں شوہر کو آگاہ کیا۔

"اچھا پھر جیسے تمہیں مناسب لگتا ویسا کرو۔۔"

"ڈانٹ کا بھی ذرا اثر نہیں ہو رہا معاذ کو، چار دن سے مسلسل لگی ہوئی۔۔" نویدہ نے موقع ملتے ہی ایک نیا کارنامہ شوہر کے گوش گزار کیا۔

"یاد رہے! پرسوں آخری تاریخ ہے داخلے کی۔" احمر جو بچوں کو ڈانٹنے کے حق میں بالکل نہیں تھا، آج شریک حیات کو انہیں مارنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ محض اس لیے کہ وہ جلد از جلد اردو میڈیم اسکول چھوڑ کر انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ لے لے، جہاں صرف محدود نشستیں باقی تھیں۔

٭٭٭٭

"کیا ہوا تابندہ؟" مس نورین جو کافی دیر سے تابندہ کو سر تھامے بیٹھا دیکھ رہی تھی، پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

مس تابندہ نے ایک نظر نورین کو دیکھا اور واپس سر جھکا گئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" مس نورین نے متجسس لہجے میں ایک اور سوال داغا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن بے حد پریشان ہوں میں۔" تابندہ نے الجھے الجھے لہجے میں نورین کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

"کیوں پریشان ہو؟ گھر میں سب خیریت ہے نا۔۔" جب سارے جہانوں کی فکر نورین کے لہجے میں سمٹ آئی۔ تو تابندہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے مناسب الفاظ ذہین میں ترتیب دینے لگی۔

"تم تو جانتی ہو، مجھے اردو ادب سے کتنی محبت ہے اور جس چیز سے محبت ہو، اسے ختم ہوتے دیکھنا کہاں آسان ہوتا۔" مایوس کن لہجے میں کہتے تابندہ نے سامنے موجود کتاب بند کی۔

"کل ایک ماں اپنے بیٹے کو مار مار کر انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ کے لیے راضی کر رہی تھی، جس کی چھوٹی بیٹی پہلے ہی انگلش میڈیم اسکول میں جاتی ہے۔"

"تو اس میں ہرج کیا؟" نورین نے کافی حیران ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

اگر سب انگریزی سیکھیں گئے تو اردو کون پڑھے گا؟ تمہیں معلوم ہے۔۔ اردو صرف ایک زبان کا نہیں ایک تہذیب کا نام ہے۔۔ یہ ہے تو ہم ہیں۔" تابندہ نے مس نورین کو آگاہ کیا اور سامنے موجود پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا۔

"مجھے تو لگتا اس کے اور بھی کئی نقصانات ہیں۔۔ لیکن میں آج پہلی بار آپ کو اردو کے حق میں بات کرتے سن رہی ورنہ کسی کو رتی برابر اس کی پراہ نہیں۔" مس نورین نے بھی سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"یہی تو افسوس ہے! ہم سے ہماری پہچان چھینی جا رہی اور سب خاموش تماشائی بنے دیکھ رہے۔" بے بسی سے کہتے تابندہ نے میز پہ رکھے گلدستے میں سجے خوبصورت پھولوں کو دیکھا۔

"تمہارے ایک کے بولنے سے کیا ہو گا پیاری؟ میرا مشورہ ہے تم بھی خاموش ہی رہو، جیسے باقی سب چپ ہیں۔۔ یقین مانو اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔" پتے کی بات سمجھاتے ہوئے مس نورین اپنا سامان سمیٹ کر کلاس لینے چلی گئی اور تابندہ ناجانے کتنی دیر تک ماوف ہوتے ذہین کے ساتھ خالی کرسی کو گھورتی رہی۔۔
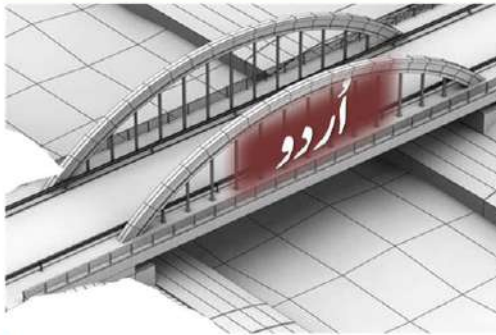
"گونگا پاکستان"   مہرین حسین

امی جان میں یونیورسٹی جارہاہوں خداحافظ !

خداحافظ بیٹا!

دروازے سے باہر جاتے سکندر کی سماعتوں سے امی کا مٹھاس سے لبریز جملہ ٹکرایا۔۔۔۔

مطمئن سی مسکراہٹ سکندر کے لبوں پر بکھر گئی۔۔۔

****

آج یونیورسٹی میں سکندر کی پریزنٹیشن تھی وہ ٹائی ٹھیک کرتا ہوا کلاس میں داخل ہوا، کمرے میں قدم رکھتے ہی روز مرہ کی طرح کئی لڑکے لڑکیاں جملے کسنے لگے،۔۔'وہ دیکھ اردو کی کھلی کتاب'۔۔ایک اور نے اواز لگائی 'غالب جی'کسی نے کہا'اقبال کا شاہین تشریف لاچکاہے'یہ سب معمول تھااس لیے سکندر نظر انداز کرتا ہوااپنی نشست پر آکر بیٹھ گیاکچھ ہی دیر میں پروفیسر بھی آگئے۔۔،،،،

تھوڑی دیر میں پروفیسر نے باقاعدہ طور پر پڑھائی کا آغاز کرتے ہوئے سکندر کو پریزنٹیشن کے لیے مدعو کیا،،،،

سکندر نے اپنی نشست سے پروفیسر کی میز تک جانے کے سفر میں کئی آوازیں سنیں دھیمی آواز میں یہ آوازیں مختلف لڑکے لڑکیوں کی تھیں۔۔۔۔

بورنگ'۔۔'اردو کا سہرا سجائے گا اور تو کچھ نہیں آتا'

'یار نیند آرہی ہے اسکا اردو ورجن سننے سے پہلے ہی'۔۔۔

دل میں اسے تکلیف ضرور محسوس ہورہی تھی لیکن نہایت تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سکندر نے ایک نظر سامنے بیٹھے طلبہ کو دیکھا اور سلام کیا۔۔چند ایک آوازیں ہی تھیں وہ جنہوں نے سلام کا جواب دینا گوارا کیا،،

جی آج کا جو عنوان ہے وہ ہے اقبال،،تو سکندر تیاری پوری ہے آپ کی؟پروفیسر جو سینے پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے سکندر سے پوچھا۔۔۔۔

جی سر الحمدللہ۔۔۔۔سکندر نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسکیوز می سر!

اس کے پاس اردو کا میزائل ہر وقت تیار ہوتا ہے انتظار ہے تو بس اپ کے اجازت کاہاہاہاہاہاہاکلاس میں موجود تمام طلبہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔۔۔۔

اس قدر تذلیل پر سکندر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیااور شدید غصے میں وہ گویاہوا۔۔۔

بہت معذرت کے ساتھ سر۔۔۔

لیکن آج میں اقبال کے متعلق جو پریزنٹیشن دینے آیاہوں میں نہیں دوں گا۔۔۔۔۔

اج شیکسپیئر کو پریزنٹ کرنا ہے کیا؟ پروفیسر نے کلاس کے باقی طلبہ کا ساتھ دیتے ہوئے ہنس کر کہا۔۔۔

جواب میں سکندر مسکرا دیا۔۔ اور گویا ہوا سر میں الحمدللہ خود کو دل سے آزاد محسوس کرتا ہوں غلامی میں دھسے قہقہے لگانا میرے بس میں نہیں ہے۔۔

کوئی پوچھے تو کس پر ہنس رہے ہیں آخر یہ لوگ؟

میرا جواب ہو گا،، 'اپنے ہم وطن پر'...

کس بات پر ہنس رہے ہیں؟

میرا جواب ہو گا،،۔ جناب اپنے ہی باغ کے گلاب کی خوشبو سے مسرور ہوتے ایک شخص پر ہے یہ جہاں ہنس رہا۔ یہ لوگ خود اپنے باغ کی حفاظت نہیں کرتے پرائی ٹہنیوں پہ نازاں ہیں۔۔۔۔

خیر آج وضاحت کرنا چاہوں گا کہ آخر یہ اردو کیا ہے؟ میرا کیا رشتہ ہے اس کے ساتھ؟ اور آپ کی کیا ہے دشمنی؟

دراصل اپ لوگ اتنے پستی میں جا چکے ہیں کہ اپنی زبان کو اپنی شخصیت پر بوجھ سمجھنے لگے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے ایسی قوم اور نسل مردہ کہلاتی ہے جو اپنے اصل کو چھوڑ کر محض سائے کو اپنانا چاہے۔ یاد رہے زندہ ہیں وہ قومیں جنھوں نے اپنی زبان کو اپنی پہچان بنایا اور بنائے رکھا۔ ہمارے سامنے مثال ہے، زندہ مثال 'ترکیہ' ایک زندہ قوم ہے ایسا کہا جاتا ہے، ان سے بات کرنے کے لیے لوگ ان کی زبان سیکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنی زبان کے ساتھ کسی اور زبان کو چند روپوں کے فائدے کے لیے شامل نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ کامیاب ہے وہ۔۔۔

پاکستان، آزاد ملک، اسلامی جمہوریہ پاکستان، نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے والا ملک جس میں اج یہ حالات ہیں کہ یہاں کے لوگ یعنی پاکستانی ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول کر چار لوگوں میں ذلیل ہونا پسند کرتے ہیں لیکن اردو کا استعمال ان کے لیے انا کا مسئلہ ہے معاشرے میں عزت کا درجہ زبان کے ترازو میں تولا جاتا ہے ۔۔۔۔ سکندر ایک لمحے کے لیے رکا نظریں زمین پر جماتے ہوئے گہری سانس لی، ساری کلاس میں موجود طلبہ اور پروفیسر بغور اسے سن رہے تھے اور ایسا پہلی بار ہوا تھا اندر ہی اندر سکندر نے خوشی محسوس کی اور گہرے اعتماد کے ساتھ اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے قدر نرم لہجے میں بولا،،

سوال یہ ہے کہ یہ کس کی غلطی ہے سابقہ حکمرانوں کی یا موجودہ حکمرانوں کی!

یہ کسی ایک کی غلطی نہیں ہے یہ ہم سب کی غلطی ہے آپ کی اور میری غلطی ہے کہ ہم نے اپنے معاشرے کو ایسا بنا دیا ہے کہ جس کے لیے انگریزی قابل قبول ہے مگر اردو گوار، مڈل کلاس، لوگوں کی بولی بنا کر رکھ دی ہے اردو کو کمتر قرار دیا ہے اردو کے ساتھ ساتھ اردو کے بولنے والوں کے ساتھ بھی یہ ظلم کیا جاتا ہے انہیں حقیر جانا جاتا ہے۔ اور یہ سوچ اس قدر پختہ کر دی ہے کہ کئی ہنرمند بے روزگار ہیں، بے شمار نے اپنی زندگی کی شمع بجھا

دی، اور لاتعداد جوتے سیدھے کر رہے ہیں گھر کا دیا جلانے رکھنے کے لیے،،

یہ وہ لوگ ہیں جن کو صرف ایک موقع دیا جائے تو اپنے ہنر سے ملک کو پستی سے نکال سکتے ہیں لیکن انگریزی کے طلسم میں جکڑا معاشرہ انہیں تسلیم کرنے سے انکاری ہے،، میں آپ سب سے الگ نہیں ہوں، آپ سب کے ساتھ رہتا ہوں، جیتا ہوں، اسی معاشرے کا حصہ ہوں، میں نہیں کہتا کہ مجھے اردو پہ عبور حاصل ہے اور نہ ہی میں انگریزی سیکھنے یا بولنے کے خلاف ہوں بس اختلاف ہے صرف اتنا کہ قابلیت کو انگریزی کے ترازو میں ہرگز نہ تولہ جائے نوکری اچھی ہونے کے لیے انگریزی لازم، عزت سے جینا ہے تو انگریزی، محبت کے!

ایک دم اس کی زبان رک گئی اس کا مذاق اڑانے والے لڑکے لڑکیاں چونک گئے سب کی نظریں سکندر پر جمی ہوئی تھی چار سو کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی سکندر کی آواز نے یہ سکوت توڑا بہت ہمت کر کے وہ مزید گویا ہوا،۔۔۔

آپ لوگوں کو حیرت ہو گی لیکن یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ میری محبت کی دشمن بھی یہ۔۔۔۔۔۔ سکندر کی بات کاٹ کر ایک لڑکا جو بڑے غور سے سن رہا تھا بول اٹھا،

انگریزی کی وجہ سے کیا؟ اس کے سوال پہ سکندر کے چہرے پر پھیکی سی مسکان بکھری اور اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔۔

کسی حد تک ایسا ہی ہے دوست۔۔۔ جس سے محبت میں گرفتار تھا اس کے والد کو میرے حلیے سے طور طریقے سے سخت اختلاف تھا ان کی ایک شرط تھی کہ مجھے اپنے لہجے سے یہ نرمی ختم کرنی ہو گی اور سخت لہجہ اپنانا ہو گا اردو کی جگہ لیٹسٹ انگلش کو دینی ہو گی غرض یہ کہ مجھے خود کو بدل کر ان کے سانچے میں ڈھالنا تھا ۔۔ میں اس سب کے خلاف ہوتے ہوئے بھی آنیہ کا کہنہ ڈال سکا سب سے پہلے میں نے انگریزی کو سیکھنے کی کوشش کی پر میرا یہ ذہن اور اس میں بسی اردو انگریزی کو سمجھ نہ سکی، ٹینسز، پاسٹ، فیوچر، ان سب میں، میں کچھ ایسا الجھا کہ آنیہ کے والد آنیہ کو اپنے ساتھ دبئی لے گئے مجھ سے بہت دور،، جبکہ آنیہ کو پسند تھا میرا اس کو 'حسیں' کہنا 'مجھے تم سے فقط پیار نہیں عشق ہے' کہنا .... خیر سکندر نے اپنا درد سمیٹتے ہوئے واپس اصل موضوع کی طرف لوٹا اور مزید گویا ہوا ہے۔۔۔

یہ سب بتانے کا مقصد ہے کہ انگریزی ہماری جڑوں تک پھیل گئی ہے زندگی کے ہر معاملے میں اس کا دخل ہے جو انتشار کی وجہ ہے کیونکہ یہ آج ہمارے ملک میں ایک انسان کی جان سے زیادہ اہمیت حاصل کر چکی ہے، اس بارے میں یقیناً کسی نے غور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہو گی کہ اردو ہمارے طرز زندگی کو، ثقافت کو، خاندان کی تمام باریکیوں کو، بآسانی اور بہت خوبصورتی کے ساتھ واضح کرتی ہے اردو صرف ایک زبان نہیں ہے اس میں تہذیب ہے ادب ہے انگریزی میں چھوٹا بڑا ماں باپ گرل فرینڈ بیوی سب یوں ہیں کوئی فرق نہیں ہے کسی میں بھی کسی رشتے کے لیے وہ مٹھاس نہیں محسوس ہوتی جو ہماری پیاری زبان

اردو میں موجود ہے عزت ہے منفرد مقام ہیں 'تم اور آپ' کا فرق موجود ہے جہاں انگریزی میں سب یکساں ہیں وہاں اس ادب سے لبریز زبان پر یہ ظلم کیوں؟؟؟؟؟

اردو تو پاکستان کا وقار ہے، مان ہے، تو اس کا مقام کیوں گم ہے؟ میں بارہا کہہ رہا ہوں میں انگریزی میں خامیاں نکالنے کا حامی نہیں ہوں پر جب مقابلہ اردو سے کیا جاتا ہے تو یہاں معاملہ خراب ہوتا ہے ہم سب کیا جانیں ملک کو پانے اور بنانے میں کتنی ماؤں نے اپنے لال، کتنی بیویوں نے اپنے سر کے تاج، بچوں نے باپ، تب جا کر یہ ملک اور آزادی نصیب ہوئی،،،،

لمحہ فکریہ تو یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں ازادی دلانے کے لیے اپنی نسلیں قربان کر دی تھی اور ہم واپس لوٹ کر غلامی کی طرف جا رہے ہیں اور خوشی خوشی جا رہے ہیں ہر جگہ سننے کو ملتا ہے جی 'نیا پاکستان'، دراصل یہ بکا ہوا پاکستان ہے جہاں اپنی ہی زبان بہت سوچ کر ان لوگوں سے بولتے ہیں جن کا ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی سے واقف نہیں ہے یعنی ہم انہیں کمتر سمجھ کر اردو بول لیتے ہیں وگرنہ سو کال ماڈرن لوگوں میں اردو بولنے میں شرم محسوس کی جاتی ہے۔

جس دن ہر انسان بنا شرم جد کے اردو فخر سے بولے گا اس دن یہ نعرہ بلند کرنا نیا پاکستان، اردو کا نفاذ اگر حکومت نہیں کر رہی تو ہم ایک بار ایک آواز ہو کر اردو کی آواز بن کر ان حکمرانوں کی سماعتوں سے ٹکرائیں تو ہم اردو کو اس کا کھویا مقام دلا سکتے ہیں، گر ہم کوشش کریں تو!

لیکن! سوچ کا معیار گر چکا ہے، خود ہم نے اپنا معیار گرا لیا ہے، دیر تو ہو چکی ہے مگر اس سے قبل کے چاروں اور غلامی کے سائے مزید گہرے اندھیرے میں تبدیل ہوں ہمیں قدم اٹھا لینا چاہیے۔!!

بہت معذرت لیکن موجودہ پاکستان 'گونگا پاکستان' ہے جس کے پاس اپنی ہی آواز بلند کرنے کے لیے اپنی ہی زبان کا استعمال کرنے کا حق نہیں اور نہ ہی کوئی اہمیت ہے،،

اور میں آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ امید ہے، جو لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے محض اس لیے کہ میں انگریزی کی جگہ اردو کا صحیح استعمال کرتا ہوں وہ اتنا ضرور جان گئے ہوں گے کہ وہ میرا نہیں اپنی قومی زبان اردو کا مذاق بنا رہے ہیں۔۔ سکندر اپنی بات مکمل کر چکا تھا۔۔۔ کئی شرمندہ چہرے، نم آلود آنکھیں اور پر ستائش نظریں، سکندر نے دیکھے۔۔۔۔۔

احساس ندامت میں گھرے تمام طلبہ اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تالیوں کا ایک شور بلند ہوا لڑکوں کا وہ ٹولہ جو سکندر کا جینا حرام کیے ہوئے تھے سب سکندر کے گلے لگ گئے سکندر کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا اس کے ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

گونگا پاکستان

از قلم عروۃ الھدیٰ ملک

"دس روپے کے بارہ کیلے"۔

"ٹین ڈبے والا بھوسی ٹکڑے والا"۔

"اللہ کے نام پہ اس فقیر کو دو روٹی کا آٹا دے دو"۔

"ہم نہ ہوں ہمارے بعد ہمارا لیڈر زندہ باد"۔

"آپ ہمیں ووٹ دیں ہم آپ کو زندہ رہنے کی تمام آسائشیں دیں گے"۔

اس آخری نعرے پر حبیبہ کا فلک شگاف قہقہ بلند ہوا تھا۔

"حد اور ضرورت دونوں سے ہی زیادہ چھوڑ دی اس بار تو۔ زندہ رہنے کی تمام آسائشیں واہ! ان کی اگلی پچھلی سات نسلیں بھی یہ دعویٰ پورا نہیں کر سکتیں زندہ رہنے کے لئے انسان کی آسائشیں کبھی بھی تمام ہی نہیں ہو سکتی تو یہ پوری کیا خاک کریں گے۔ یہ تو وہ اندھا کنواں ہے جو ختم نہیں ہوتا جو اس میں گرتا ہے گہرائیوں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔ خیر! یہ بات تو ان عقل سے پیدل سیاست دانوں کے گنجے سر میں کبھی نہیں سما سکتی اور سمائے بھی کیوں ان کا کام تو ویسے بھی جھوٹے وعدوں سے ہی چل جاتا ہے۔ جن کے لئے دماغ نامی شے کی ضرورت نہیں ہوتی"۔

حبیبہ ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے آنے والی مختلف آوازوں پر خود کلامی تبصرے کرتی ہوئی کہتی ہے۔

"کون کہتا ہے پاکستان گونگا ہے پاکستان کی عوام کے منہ میں جتنی لمبی اور تیز تڑار زبان ہے شاید ہی اس کرہ ارض پر کسی اور مخلوق کے منہ میں ہو۔ یہاں صبح بھی پاکستان کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سے ہوتی ہے، دوپہر کا کیلولا بھی ان ہی آوازوں کی نظر ہوتا ہے اور رات کا پرسکون آرام بھی۔ صبح سبزی والے کی صدا سے ہوتی ہے، دوپہر کو فقیر جان چھوڑنے کو راضی نہیں، شام کو ہمارے سیاست دانوں کے جلسے اور اُن کے متوالوں کے پُر جوش نعرے اور رات میں پاکستان کے شاہین گلی کو نائٹ کلب تصور کر کے ایسا ماحول بنا کر رکھتے ہیں کہ انسان کے پاس کانوں میں روئی ٹھونس لینے کے علاوہ کوئی راہ فرار نہیں ہوتی۔

کیا ہی ہوتا کے اگر یہ پاکستان اپنی آواز محض نعروں کے نام نہیں کرے, اس ملک میں سانس لینے والے باشندے یہ آواز اپنے حق کے لیے بھی استعمال کریں، اپنے فرض ادا کرنے کے بعد اپنے حقوق لینے کے لیے بھی آواز اٹھائیں، مظلوم خود پر ہونے والے ظلم کو خاموشی سے سہنے کے بجائے ظلم کے خلاف بولیں اور یہ مظلوم صرف طبقہ اشرافیہ کے نہ ہوں، بلکہ ملک کے متوسط طبقہ کے مظلوم کی بھی ہوں جن کی آواز اس ملک کی طاقتور آوازوں کے آگے دب کر رہ جاتی ہے، کاش یہ ملک اللہ رب العزت کی عطا کردہ زبان اور بہتر بولنے کی صلاحیت کو صحیح جگہ اور صحیح طریقے سے استعمال کر سکے"۔

عالیہ "تمہیں پتہ ہے حبیبہ آج کون آیا ہے گراؤنڈ میں"؟

حبیبہ کی خود کلامی کی داستان کو اختتام سے پہلے ہی عالیہ انجام بخش دیتی ہے۔

حبیبہ " تمہیں کیا لگتا ہے تازی ہوا کے لیے بنائی جانے والی ان کھڑکیوں سے صرف تازی ہوا ہی آتی ہے "؟

حبیبہ کے اس طنز سے لبریز سوال پر عالیہ کا قہقہ فلک کو چیرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ذرا دیر رک کر عالیہ جواب دیتی ہے۔

عالیہ " جانتی ہوں کہ اپنے کمرے کی ان چار کھڑکیوں سے آنے والی انتہائی غیر ضروری آوازوں سے تم عاجز آچکی ہو لیکن ذرا غور سے سنو تو مجھے آج کی کچھ مخصوص آوازوں کی منطق ہی سمجھا دو"۔

حبیبہ " بادِل نخواستہ سن ہی رہی ہوں پوچھو جو پوچھنا ہے "؟

عالیہ " کیا ہمارا ملک محض نعروں کے سہارے چلتا ہے، کیا ملک کے سیاست دان کا کام صرف اتنا ہے کہ ہر بار الیکشن کے قریب وعدے کریں اور ووٹ لے لیں اور یہاں کی عوام کا کام صرف گونگے بن کر ووٹ دینا ہے "؟

حبیبہ " نہیں ایسا بالکل نہیں ہے کوئی ملک نعروں کے سہارے کیا انقلابی نعروں کے سہارے بھی نہیں چل سکتا اسی طرح ہمارا ملک بھی سیاست دان اور عوام کے فرائض کی ادائیگی سے چل رہا ہے ۔ہاں بس ہمارے ہاں سرکار کا فرض صرف الیکشن کے دنوں میں ووٹ لینے کے لیے کھوکھلے وعدے کرنا ہے اور عوام کا فرض اُن وعدوں پر ہر بار اعتبار کر کے ووٹ دینا ہے۔ اور جہاں تک سوال ہے گونگے ہونے کا تو یہ بات تو بہن ذہن نشین کر لو کہ اس اندھیر نگری کے معزز حکمران ہوں یا پھر بے بس عوام گونگے تو دونوں ہی نہیں ہیں۔ الیکشن کے موقع پر دیکھو یا مخالف پارٹی پر حملے کرتے ہوئے، جلسوں کے خطاب کرتے ہوئے تو کبھی مخالف پر لفظوں کی گولہ باری کرتے ہوئے۔ سیاست دان جیسی شخصیات دل اور منہ کھول کر بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور عوام کی بات کی جائے تو یہ نایاب عوام سیاست دانوں کو گالیاں دینے کے لئے سب سے پیش پیش اپنی زبان کے جوہر دکھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنی نااہلی اور کم عقلی کو پس پشت ڈال کر اپنے ہی منتخب کردہ منصب بردار انہیں چور، لٹیرے اور ڈاکو نظر آتے ہیں۔ جس کا اظہار یہ سڑکوں پر دھرنے دے کر، ٹائر جلا کر اور فلک شگاف نعرے لگا کر کرتے ہیں"۔

عالیہ حبیبہ کی بات تقریباً کاٹتے ہوئے کہتی ہے۔

عالیہ "لیکن ایک طرح سے تو یہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہوئے۔ حکمران اگر جوشیلی تقاریر اور تڑکتے بھڑکتے نعروں سے عوام کو قائل نہیں کریں گے تو عوام اُنہیں ووٹ کیسے دے گی؟ پاکستان کے سنہری دور میں بھی تو ہمارے عظیم رہنماؤں نے اس وقت کی سوئی ہوئی عوام کو اپنی تقریر سے ہی تو بیدار کیا تھا اور عوام اگر سڑکوں پر نکل کر شور ہنگامہ نہ کرے تو کیسے اظہار کرے "؟

حبیبہ " چلو ایک وقت کو یہ بات مان لیتے ہیں کہ جوشیلی تقاریر بے سود نہیں لیکن کیا ان عظیم رہنماؤں اور آج کے مفاد پرست

رہنماؤں کی تقاریر میں فرق نہیں؟ عرش اور فرش میں جتنا فرق ہے اتنا ہی ان تقاریر کے مابین فرق ہے۔ وہ تقریر حق اور صداقت پر مبنی تھی نہ کہ جھوٹ اور فریب پر وہ آواز پوری قوم کو متحد کرنے والی آواز تھی نہ کہ ذاتی مفاد کی غرض کی خاطر قوم کو ریزہ ریزہ کرنے والی اور یہی نہیں وہ آواز ملک کے دفاع کے لیے بڑے سے بڑے ایوان میں بھی اٹھی نہ صرف اٹھی بلکہ اس آواز میں موجود صداقت اور جذبے نے اُن ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

آج کے رہنماؤں کی آواز میں اگر صداقت ہو تو وہ بھی پوری دنیا میں پاکستان کا ڈنکا بجوا دیں۔ لیکن افسوس کہ آج کے رہنما اپنے نام کی لاج رکھنے میں بھی ناکام نظر آتے ہیں۔ رہا سوال عوام کا کہ وہ شور نہ مچائیں تو اظہار کیسے کریں؟ تو شور اور ہنگامہ ہی اظہار کا طریقہ نہیں ہے اپنی بات یا خود پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے سڑکوں پر ہنگامہ برپا کرنا حل نہیں ہے بلکہ اپنی آواز میں وہ جذبہ پیدا کرنا چاہئے کہ وہ آواز دھیمی ہو کر بھی حکام بالا تک پہنچ سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ آج اس ملک کے ریڑی والے اسے لے کر اس ملک کے حکمران میں سے کسی کے پاس وہ آواز نہیں جس میں صداقت ہو۔ عام مثال روز بہ روز بڑھتی ہوئی مہنگائی کی ہی لے لیتے ہیں۔ مہنگائی کے خلاف سڑکوں پر آنے والی عوام میں سبزی فروش سے لے کر بڑے تاجر تک تمام شامل ہوتے ہیں لیکن دیکھا جائے تو اپنی اپنی جگہ پر یہ سب بھی اس مہنگائی کے بڑھنے میں برابر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ کیوں کہ سب اپنی اپنی جگہ پر کرپشن میں حصہ ڈال رہے ہوتے ہیں۔ یہی چھوٹی چھوٹی کرپشن بڑھ کر ملک کو اس قدر نقصان پہنچاتی ہے کہ وہ نقصان مہنگائی کی صورت میں سامنے آتا ہے"۔

عالیہ "لیکن کرپشن تو وہ ہوتی ہے ناں جو سیاست دان کرتے ہیں"۔

حبیبہ "نہیں کرپشن تو ہمارے پیارے پاکستان میں ہر عام انسان کرتا ہے"۔

عالیہ "وہ کیسے"؟

حبیبہ "کرپشن صرف پیسوں کی ہیر پھیر کو نہیں کہا جاتا بلکہ ہر بد عنوانی اور بے ایمانی کرپشن ہے۔"۔

عالیہ "سچ میں حبیبہ"۔

حبیبہ "ہاں، تم بھی تو کرپشن کرتی ہو"۔

عالیہ "میں تو بس ایک بچی ہوں میں کیسے کرپشن کر سکتی ہوں"؟

حبیبہ "جب تم امتحان میں نقل کرتی ہو تو وہ بھی کرپشن ہی ہوتی ہے"۔

عالیہ "نہیں حبیبہ میں پہلے بلکل نقل نہیں کرتی تھی لیکن میرے ہم جماعت ساتھی نقل کر کے مجھ سے بہتر نمبر لے لیتے تھے۔ میری دوستیں بتا رہی تھیں کہ استاد جی نے کچھ بچوں سے پیسے لے کر انہیں اچھے نمبر دیے ہیں"۔

حبیبہ "ضروری نہیں حبیبہ جو دوسرے کریں وہی ہم بھی کریں ہمیں تو اپنے ملک کے لیے مثبت آواز بننا ہے۔ ہم ہی اگر کرپشن

کے دلدل میں کود جائیں گے تو اس ملک کے لیے بے غرض آواز کون بلند کرے گا۔ ہمیں تو اس قوم کے لیے اقبال کے شاہین بننا ہے جس کی انقلاب سے لبریز، صداقت پر مبنی اور روح کو بیدار کرنے والی آواز نے برسوں پہلے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا تھا۔ ہمیں آج غلط راستے پر چل پڑی قوم کو اپنی آواز سے راہ راست پر لانا ہے"۔

عالیہ "لیکن حبیبہ جو استاد جی نے کیا"۔

حبیبہ "ہاں میں مانتی ہوں کہ استاد جی نے غلط کیا لیکن تمہیں اُن کی پیروی کرنے کے بجائے کسی بڑے کو ایک بار بتانا چاہیے تھا۔ تا کہ ہم اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ اب تم وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی بھی کرپشن کر کے ملک سے غداری نہیں کرو گی"۔

عالیہ "میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ یہ بدعنوانی کبھی نہیں کروں گی ۔ محنت سے پڑھ لکھ کر اپنے ملک کے لیے حق کی صدا بلند کروں گی۔

اب تم جاؤ اور پڑھائی کرو۔"

استاد جی بھی کرپشن کی قطار میں لگ گئے واہ میرے مالک تیری عطا کردہ گلستان کا مالی ہی آج پھولوں کا دشمن بن گیا۔"

"ارے دیکھو دیکھو سنبھالو کوئی"۔

کھڑکی سے شور آنے پر حبیبہ اور عالیہ دونوں کی توجہ اس جانب جاتی ہے۔ باہر دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی کا ایک کارکن صبح سے نعرے لگا لگا کر بے ہوش ہو گیا۔

"باجی آپ کو معلوم ہے"؟

یہ عمر تھا جو ابھی ہانپتا کانپتا باہر سے آیا تھا۔

"ایک کارکن بے چارہ صبح سے بھوکا پیاسا جلسے کے کاموں میں مصروف تھا اور اب نعرے لگاتا لگاتا ہی بے ہوش ہو گیا"۔ عالیہ "صرف نعروں سے یہی ہاتھ آسکتا تھا"۔

"ہم کرپشن سے پاک پاکستان کی بنیاد ایک بار پھر نئے سرے سے ڈالیں گے، ہم اس پیارے ملک میں انصاف کا بول بالا کریں گے، جہاں ہر مظلوم پر ہونے والے ظلم کا حساب لیا جائے گا، ملک کے ہر باشندے کو آزادی اور بے خوفی سے جینے کا حق دیا جائے گا، آپ کا ایک ووٹ پاکستان کی قسمت سنوار سکتا ہے، صحیح ووٹ صحیح انسان کو دے کر آپ کی اپنی پارٹی کو کامیاب بنائیں"۔

"اللہ کے نام پہ ایک روٹی کے آٹے کا سوال ہے بابا بچے سویرے سے بھوکے ہیں رے بابا"۔

انڈے گرم انڈے، دیسی مرغی کے اُبلے ہوئے انڈے لے لو "۔

"ابے او سالے کل جو فون پکڑا تھا لا نکال"۔

"کمال بھائی آپ مہربانی فرما کر اپنی گاڑی اگر ذرا آگے کھڑی کر لیں تو یہاں میری گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی ہو جائے گی"۔

گونگا پاکستان

زینب نثار بھٹی (نورے)

بیت چکے ہیں "تیئس" سال

گونگا ماضی اندھا حال

اجڑے پنچھی ٹوٹی ڈال

پھیلے ہیں انجانے جال!

بیت چکے ہیں "تیئس" سال

عزم سے خالی ہے دستور

جہد و عمل کی منزل دور

شمع قیادت ہے بے نور

گلشن میں پھولوں کا کال

بیت چکے ہیں "تیئس" سال

عقل و فراست ہیں بیمار

فکر و نظر والے بیکار

دیدہء وحشت ہے بیدار

لرزاں ہے ہمت کی ڈھال

بیت چکے ہیں "تیئس" سال

ساغر صدیقی

ڈھلتی شام کا وقت تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں سیاہیوں کے سمندر میں مدغم ہو رہی تھیں، اداسیاں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اتری چلی جا رہی تھیں، یاسیت زدہ دَر و بام پر ویرانیت کے ڈیرے جمے تھے۔ درختوں کے بیچ ہلکی زرد روشنی میں اس کھنڈر نما گھر کے در و بام سے وحشت ٹپک رہی تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ وحشت اس کوٹھری نما گھر میں قید اسکے دل میں تھی جو ایک بوسیدہ بستر پر پڑی اپنی رہائی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"لڑکی ایک دن گھر سے باہر رہے تو طعنہ زنی کے ساتھ اس پر بے انتہا الزامات کی بوچھاڑ بھی کی جاتی ہے لیکن جو لڑکی چار راتیں گھر سے باہر بتائے۔۔ اسکو تو کوئی قبول بھی نہیں کرتا۔۔" مہرو نے روتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا

"کیا مجھے بچانے کوئی آئے گا؟" مہرو کی بڑبڑاہٹ اس خاموشی میں خلل ڈالنے لگی

"کوئی نہیں آئے گا۔۔لوگ تو عافیہ صدیقی کی رہائی کے لیے کچھ نہ کر سکے اور پھر تم ٹھہری ایک غریب کسان کی بیٹی۔۔"اس بار ماحول کی پر اسراریت ہی بڑھی تھی سناٹے میں خلل نہ ڈل سکا شاید ضمیر نے جھنجھوڑا تھا اسے

"عافیہ۔۔امت کی بیٹی۔۔پاکستان کا فخر تھی نا۔۔بہت کچھ برداشت کیا ہے اس نے۔۔اب میری باری ہے۔۔عافیہ تو ابھی تک زندہ ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ میں سیٹھ تیمور کے ظلم و جبر کے سائے میں کتنی ساعتیں اور لیتی ہوں؟"مہرو نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن بہت مضبوطی کے ساتھ پلنگ سے باندھے جانے پر وہ ناکام ہو گئی

"یہ قوم کیوں اندھی، گونگی، بہری بنی ہوئی ہے؟کیوں کسی کی خاطر آواز بلند نہیں کرتی؟کیوں جہاد اور قتال کے واسطے نہیں نکلتی۔۔ان سب کی بدولت پاکستان کو گونگا کہا جاتا ہے۔۔لیکن میرا ملک ایسا نہیں ہے۔۔گونگے تو یہاں کے باسی ہیں۔۔"مہرو نے روتے ہوئے سوالات کی بوچھاڑ کی لیکن جواب وہ شاید اپنے رب سے چاہتی تھی۔

بڑی سی گاڑی سے نکلنے والے صاحب کی پرسنالٹی دیکھ کر ایک بار تو جی خوش ہو گیا۔۔۔سانولی رنگت، گھنی سیاہ مونچھیں اور دھوپ کا چشمہ۔۔چھ فٹ کے تن پر سفید بے داغ لٹھے کا کھڑ کھڑاتا ہوا لباس۔۔پیروں میں کھسہ جبکہ بائیں ہاتھ میں سگریٹ کا دھواں دیتا ٹکڑا

یہ سیٹھ ابرار صاحب تھے بڑے زمیندار۔۔اور بزنس مین بھی، پولٹری فیڈ سے متعلق بھی کاروبار تھا ان کا،اس شخص کی رعب دار شخصیت یقیناً متاثر کن تھی،وہ لوگوں کے مسائل سننے کے لیے ڈیرے پر حاضر ہوئے۔

"صاحب جی۔۔میری بچی مجھے واپس کر دیں۔۔"اس ضعیف انسان نے کپکپاتے لہجے میں کہا

"چچا شریف۔۔تمہاری لڑکی گھر سے بھاگی ہے۔۔میرے پاس نہیں ہے کہ میں واپس کر دوں۔۔"سیٹھ ابرار نے تمسخرانہ انداز میں کہا

"اے شریف تیری لڑکی بھاگ گئی۔۔تو نے تو کہا تھا کہ وہ اغوا ہوئی ہے۔۔ہائے شریف بھری جوانی میں تجھے رسوا کر دیا اس نے۔۔کہتے تھے نا مت پڑھا اسے۔۔"ڈیرے پہ موجود لوگوں نے طعنے کسنا شروع کیے، ہر ایک جانب سے اک نیا سوال اٹھتا معلوم ہوا۔

"صاحب جی۔۔میرے ان جڑے ہاتھوں کو دیکھیے۔۔میں تیار ہوں اپنی بیٹی کی شادی چھوٹے صاحب سے کرنے کے لیے۔۔میری مہرو مجھے واپس کر دیں۔۔"اس ناتواں وضعیف انسان نے ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کی

چچا شریف کی بات سنتے ہی ایک سخت نگاہ ارد گرد موجود لوگوں نے سیٹھ ابرار کی طرف ڈالی

"میں نے کہا ہے چچا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔۔ جاؤ تم یہاں سے۔۔ "سیٹھ ابرار نے حالات کو بھانپتے ہوئے کہا

"صاحب جی۔۔" اس سے پہلے چچا شریف کچھ کہتے دو بھاری بھر کم گارڈ چچا کو مضبوطی سے پکڑ کر باہر لے جانے لگے

چچا شریف کو رب تعالیٰ نے رشتے ازدواج میں بندھنے کے ۱۸ سال بعد اولاد جیسی نعمت سے نوازا۔ اپنی استطاعت کے مطابق جشن منایا گیا اور اس ننھی شہزادی کو مہر النساء کے نام سے نوازا گیا۔ چچا شریف نے گاؤں کے ریت وروایت کے خلاف جاتے ہوئے مہرو کو سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قریبی کالج میں پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ مہرو سفید رنگت کی مالک ہونے کے ساتھ ساتھ سرمگیں آنکھوں پر بھی دسترس رکھتی تھی۔ اسی دوران زمیندار کے بیٹے سیٹھ تیمور نے مہرو سے اسکی خوبصورتی کی بدولت شادی کرنے کا سوچا لیکن اس سوچ کو چچا شریف نے اسکے افعال وحرکات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رد کر دیا۔

۴ روز قبل مہرو کالج تو گئی لیکن واپس نہ آ سکی۔ چچا شریف مہرو کو ڈھونڈنے کے واسطے در در کی ٹھوکریں کھاتے، اپنی مہرو کو تلاشتے نڈھال ہو گئے۔۔

"پولیس صاحب۔۔ میری بیٹی اغوا ہو گئی ہے۔۔" عدالت میں موجود ایک کانسٹیبل وسے چچا شریف التجا کی

"چچا۔۔ کس نے تمہاری بیٹی کو اغوا کیا ہے؟" کانسٹیبل نے تفتیش لہجے میں سوال کیا

"سیٹھ ابرار کے بیٹے۔۔ سیٹھ تیمور نے۔۔" چچا نے بلا تکلف حق کہہ ڈالا

"اے بڈھے۔۔ تو پاگل ہو گیا ہے کیا؟ ابھی تو صرف تیری بیٹی اٹھائی گئی ہے، اگر تو نے یہاں مزید کسی سے بات کی یا سیٹھ صاحب کا نام لیا۔۔ تو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔۔" کانسٹیبل نے شیر کی مانند دھاڑتے ہوئے کہا

"کیوں نام نہ لوں۔ میری بیٹی ۵ دنوں سے گھر نہیں لوٹی۔۔ میں ہر جگہ انصاف کی خاطر جا چکا ہوں اور تم کہتے ہو نام نہ لوں۔۔" چچا شریف نے آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے کہا

"کیا عدالت کا وقت ہے ابھی؟" چچا شریف نے یکدم سوال کیا

"نہیں۔۔ ختم ہو چکا ہے۔۔" کانسٹیبل نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا

"ظلم راتوں کو بھی ہو جائیں لیکن عدالت فقط سویرے کھلتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے بھلا؟" چچا شریف نے واپس جانے کے لیے مڑتے ہوئے کہا

"چچا۔۔ یہ پاکستان ہے اور یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔۔ تم نے اتنا عرصہ یہاں بتایا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے۔۔" کانسٹیبل نے بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا

وہاں لوگوں کا ہجوم اس قدر تھا جیسے معلوم پڑتا ہو کہ سارا گاؤں یہیں امنڈ آیا ہے۔۔ یہاں لوگ اپنے دلوں میں عدل وانصاف کا ارمان لیے آتے ہیں لیکن واپسی پر نا جانے کتنے لوگ چچا شریف کی طرح چھلنی روح لے کر واپس لوٹتے ہوں گے۔۔

"میرا نام امِ رباب ہے۔ میرے باپ سمیت خاندان کے چار لوگ ملک جبران کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے۔۔۔ میں اس وقت فقط ۸ برس کی تھی۔ میرے گھر سے یکبارگی میں ۵ جنازے اٹھائے گئے، وہ آہیں، ہچکیاں، ماتم۔۔ سب میرے ذہن کے پردے کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔۔" چچا شریف نے ایک کم عمر لڑکی کو اپنی دہائی سناتے ہوئے دیکھا تو رک گئے

"میری ماں کتنے عرصے ہم بہن بھائیوں کو بھول کر غم مناتی رہی؟ مجھے علم نہیں۔۔ اب میں ۱۹ برس کی ہو چکی ہوں۔ ۱۱ سال بیت چکے ہیں اس سانحے کو لیکن انصاف۔۔۔ وہ ہمیں نہیں ملا۔۔" امِ رباب نے ایک رومال کی مدد سے اپنا ماتھا صاف کیا

"گیارہ سال بیتنے کے بعد بھی انصاف نہیں ملا۔۔ تو میں یہ کیسے توقع کروں کہ مجھے ۵ دن بعد ہی مل جائے گا۔۔" چچا شریف یکدم ٹھٹکے

"ملک جبران ابھی بھی اسی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ اپنے چیلوں کو لیے پورے گاؤں پر اپنا رعب ودبدبہ قائم کیے موجود ہے۔ لیکن میں بے مقدور کچھ بھی نہیں کر سکتی۔۔ میں پچھلے ایک سال سے مسلسل کورٹ کچہری کے چکر لگاتے ہوئے تھک چکی ہوں۔ یہ ننگے پیر، ہاتھ میں لالٹین تھامے، میں ہر ماہ یہاں آتی ہوں۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہوں۔ پھر اس دروازے کو بند پاتے ہوئے واپس لوٹ جاتی ہوں۔ میں ننگے پیر اگھنٹے پیدل چلتی ہوں۔ میرے پیروں میں پڑے آبلے بھی چیخ چیخ کر انصاف کا تقاضا کرتے ہیں۔۔ شاید میری قسمت میں انصاف ہے ہی نہیں۔۔۔" اس لڑکی نے کچھ لمحہ خاموش رہنے کی ٹھانی

"ننگے پیر۔۔ کیوں بیٹا؟" چچا شریف نے جھجکتے ہوئے سوال کیا

"شاید میرے ملک کے باسیوں کو مجھ پر رحم آجائے۔۔ شاید یہ عدلیہ مجھ پر ترس کھالے، شاید مجھ یتیم کو انصاف مل جائے۔۔" امِ رباب نے فوقتاً جواب دیا

"آپ بھی یہاں انصاف کے واسطے ہی آئے ہوں گے چچا۔۔ پہلے ہی بتا رہی ہوں آپ ضعیف ہیں گھر بیٹھیں۔۔ اس ربِ دوجہاں سے انصاف مانگیں۔۔ وہ یقیناً انصاف کرے گا آپ کے ساتھ۔۔ اس گونگے پاکستان میں فقط ذلیل وخوار ہونے اور ظلم برداشت کرنے کے سوا کچھ نہیں رہا۔۔ یہ کورٹ کچہری سب کچھ زیادہ بلند عہدے والے اپنے نام کر چکے ہیں۔۔ یہاں نہیں ملے گا انصاف۔۔ لوٹ جائیں۔۔" امِ رباب کہتے ہوئے چل دی

شام ڈھل رہی تھی، سورج کی روشنی مدّھم پڑتی محسوس ہوئی، چاروں طرف سے بھیانک سا اندھیرا اٹھ کر سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا، پوری فضا میں ایک عجیب سی اداسی چھانے لگی جب چچا شریف نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھا۔

"بھلا یہ سب لوگ میرے گھر کیوں آ رہے ہیں؟" چچا شریف کو دور کھیتوں کی اک جانب موجود اپنے گھر میں لوگوں کو آتا جاتا دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"شاید آنکھوں کا دھوکا ہو۔۔" چچا نے خود کو تسلی دینا چاہی لیکن وہ تسلی جھوٹی ثابت ہوئی

"کیا ہوا ہے محمود؟" چچا نے گھر میں لوگوں کے ہجوم کو دیکھتے ہی باہر کھڑے نوعمر لڑکے سے سوال کیا

"مہرو باجی۔۔"

"مہرو آگئی ہے۔۔" اس لڑکے نے مزید بھی کچھ کہنا چاہا لیکن چچا شریف کی مسکراہٹ اسے خاموش کروا گئی

لیکن یہ خوشی فقط اک لمحہ بھی برقرار نہ رہ سکی جب چچا کی سماعت سے عورتوں کے رونے کی آواز ٹکرائی تو وہ خوشی دھویں کی مانند فضا میں بکھر سی گئی

مہرو کو تیزاب کی مدد سے جھلسا دیا گیا، اور اسکی لاش کو بوری میں ڈال کر کوئی دن دیہاڑے کھیت میں پھینک گیا۔۔ جب محمود اور چند لڑکے کھیتوں کی نگرانی کے واسطے کھیتوں کا چکر لگا رہے تھے تو انھیں یہ بوری ملی۔ شکل اس قدر جھلس چکی تھی کہ پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچانی جائے۔ کپڑوں کی رنگت بھی خواب ہو چکی تھی۔ بالوں کو بے دردی سے کاٹا گیا تھا۔ انگلی میں موجود انگھوٹی کی مدد سے مہرو کی ماں نے اسے پہچانا

"مہرو۔۔" چچا شریف نے چیختے ہوئے ندا دی

"اس بچی نے سہی کہا تھا۔۔ گونگا پاکستان۔۔ در در کی خاک چھاننے کے بعد بھی میری مہرو مجھے چھوڑ گئی۔۔ یااللہ میرے ساتھ انصاف کا معاملہ فرما۔۔" چچا شریف نے مہرو کی تجہیز و تکفین کے بعد مسجد کے امام کو اپنا دکھ سناتے ہوئے کہا

"وہ کہتے ہیں نا کچھ صلے اس جہان کے لیے نہیں ہوتے۔۔۔ ایسے ہی کچھ فیصلے بھی اس جہان میں نہیں ہو پاتے، کبھی کبھی انصاف کے لیے ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے اتنا طویل انتظار کے اس کا اختتام بروز حشر پہ ہوتا ہے۔۔۔ شاید چچا آپ کے بھی کچھ معاملات اسی دن حل ہونگے، کچھ الجھنیں اسی دن سلجھیں گی کچھ صلے اسی دن ملے گے۔۔۔ اس دن کسی بڑے عہدے والے کو برتری نہ دی جائے گی۔۔" امام مسجد نے چچا شریف کا ہاتھ تھامتے ہوئے انھیں حوصلہ دینا چاہا لیکن وہ فقط ایک یہی جملہ دوہراتے رہے "گونگا پاکستان۔۔ میری بیٹی کو کھا گئے یہاں کے باسی۔۔"

گونگاپاکستان۔۔۔۔خنساء سعید

جاڑے کی خوشگوار دھوپ اپنی نرم گرم کرنیں ماں کی محبت کی طرح بلامعاوضہ ہر ایک کو دان کر رہی تھی۔ ہر وہ چیز جس پر یہ مہربان کرنیں پڑتیں کسی شہزادی کے تاج میں جڑے نگینوں کی طرح چمکنے لگتی۔ اشجار پر طیور اپنی خوش الحان آوازوں میں محفلِ موسیقی جمائے بیٹھے تھے۔ پودوں کے اردگرد قوس قزح سے ست رنگ چرائے تتلیاں محوِ رقص تھیں۔ فضا میں ایک طرف تو کیتکی کی پھبن، موتیا کی دلفریب ادا، نسترن اور سمن کا الہڑ جوبن، بنفشہ اور نازبو کا خوش رنگ پیراہن بھینی بھینی عطر بیز نسیم بہار کا مژدہ سنا رہے تھے تو دوسری طرف انہی گلوں کی پتیوں پر بیٹھی شہد کی مکھیاں اپنی پیاس بجھا رہی تھیں۔ فروری کی دھوپ میں گرمی کی ہلکی سی شدت محسوس کرنے جامعہ کے طلباء وطالبات نے اپنے سویٹر، جیکٹیں اُتار کر اپنے بازوؤں اور شانوں پر لٹکا رکھے تھے۔ ہر کوئی اس خوبصورت ماحول میں ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ایسے میں وہ ہاتھ علی پور کا ایلی ناول پکڑے، دائیں کندھے پر بستہ لٹکائے، آنکھوں پر بڑے بڑے چشمے سجائے، خوبصورت چمکدار لمبے بالوں کو بڑے سلیقے سے باندھے ہوئے اپنی ہی دنیا میں مست مگن بوڑھے برگد کے پیڑ تلے بیٹھ کر اپنا ناول مکمل کرنے لگی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ نظروں سے ناول پڑھ رہی تھی مگر کان اردگرد کی چہ مگوئیاں سننے میں مصروف تھے۔ سرسبز گھاس پر بیٹھے طلباء روز کی طرح آج بھی اُسے محترمہ اُردو دان کہہ کر ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کرتے اور زوردار قہقہہ لگاتے، قہقہے پر اُس کے کان مزید کھڑے ہو جاتے تو وہ ناول سے نظریں اُٹھا کر اُن سے کہتی۔

کیا تم لوگ خاموش نہیں بیٹھ سکتے؟

اس پر سب یک زبان ہو کر کہتے ارے او محترمہ اُردو دان یہ موٹے موٹے خالص اُردو ناول پڑھ کر کیوں اپنا وقت برباد کرتی ہیں آپ۔

یہ اُردو، اُردو ادب محض وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں پھر ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے کہتے آخر پاکستان کی جامعات میں اُردو میں بی ایس، ایم اے اور ایم ایس کراتے ہی کیوں ہیں۔ دیکھو بھئی جدید سائنسی اور مصنوعی ذہانت کے دور میں اُردو پڑھنے والے بڑے ہی احمق ہیں، چلو فرض کرو یہ اگر اُردو ادب میں ڈگری لے لیں تو نوکری کون دے گا انہیں۔ اُردو کی اہمیت ہی کیا ہے اس مُلک میں، گزشتہ ستر برسوں میں یہ اپنا مقام تو بنا نہیں سکی ہے۔ ان باتوں پر ردِ عمل کے طور پر بس اُس کی آنکھوں سے آنسو نکلتے، مگر منہ سے کچھ بولے بنا وہ چپ چاپ ناول پڑھتی رہتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رامین ایک خود اعتماد لڑکی تھی۔ اُسے اُردو ادب سے بہت لگاؤ تھا بچپن سے ہی کلیاتِ اقبال، دیوانِ غالب اُس کی پسندیدہ کتب میں شامل تھیں وہ وہاں سے اشعار یاد کرتی اور اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر بڑے ترنم، ہم آہنگی کے ساتھ اشعار پڑھتی کہ اُس کے بابا خوش ہوتے اور دل ہی دل میں سوچتے شاعرہ بنے گی میری بیٹی ۔ہر کلاس میں اُس کے اُردو کے پرچے میں سب سے زیادہ نمبر آتے، سکول سے کالج گئی تو اپنی مرضی سے اُردو ادب مضمون رکھا اور اب یونیورسٹی میں بھی وہ اُردو ادب میں بی ایس کر رہی تھی۔ مگر جب سے اُس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا تب سے ہی آہستہ آہستہ اُس کی ساری خود اعتمادی زائل ہوتی جا رہی تھی ۔دوسرے مضامین اور خاص طور پر سائنسی مضامین پڑھنے والے طلبا و طالبات اُردو پڑھنے والے طلباء کو کم تر سمجھتے اُنہیں تضحیک کا نشانہ بناتے وہ اس بات کو لے کر پریشان ہوتی اور سوچتی کیا اُردو ادب کو پڑھنے کا وہ غلط فیصلہ کر بیٹھی ہے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ یونیورسٹی میں دوسرے مضامین کے اُساتذہ کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ اُردو پڑھانے والے اساتذہ کو نہیں ملا۔ صرف یہ ہی نہیں اُس کے خاندان کے لوگ بھی اُس سے اسی وجہ سے امتیازی سلوک کرنے لگے اُس کے اعتماد کی حالت یہ ہو گئی کہ جب بھی اُس کے گھر کوئی مہمان آ کر پوچھتا،

بیٹی کون سے مضمون میں بھی ایس کر رہی ہو، تو وہ بتاتے ہوئے ہچکچاتی اور فورا بول دیتی میں ادب میں بی ایس کر رہی ہوں سامنے والا اگر کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا ہوتا تو فورا پوچھتا کون سے ادب انگریزی ادب یا اُردو ادب تو وہ ہلکی سی آواز میں کہتی اُردو ادب۔

انہی باتوں نے اُس کے ذہنی سکون کو برباد کر دیا تھا اِسی لیے وہ جب بھی اپنی کلاس سے باہر دھوپ میں کچھ دیر کے لیے ستانے بیٹھتی تو کسی سے بات نا کرتی، بلکہ بوڑھے برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر کسی نا کسی ناول یا تنقیدی کتب کا مطالعہ کرتی رہتی ۔پوری یونیورسٹی میں سے اُسے صرف اُس بوڑھے برگد سے لگاؤ تھا اُسے یوں محسوس ہوتا کہ جب بھی وہ اس پیڑ کے سائے میں بیٹھ کر مطالعہ کرتی ہے تو برگد کا درخت خوشی سے جیسے کِھل اُٹھتا ہو۔ آج بھی وہ وہاں بیٹھے مطالعہ کر رہی تھی کہ پاس بیٹھے ایک گروپ نے اُردو کو کوسنا شروع کر دیا۔ ناول پڑھتے ہوئے اُس کی دوست نے اُسے فون کر کے بتایا کہ ڈاکٹر عباس آ گئے جلدی کلاس میں آؤ وہ اُٹھی اور کتب خانے میں ناول واپس رکھ کر کلاس کی طرف چل پڑی۔

کلاس میں بے دلی سے بیٹھ کر نوٹس بناتی رہی، سوچتی رہی آخر اُردو زبان سے ایسا نا روا سلوک کیوں روا رکھا گیا ہے، اُردو پڑھنے والوں سے آخر اتنی نفرت کیوں ہے۔ آج گھر میں بھی وہ بے دلی سے داخل ہوئی ماں کو سلام کیا اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گئی ماں نے اُس کے باہر آنے کا کافی انتظار کیا پھر آخر کار وہ بول ہی پڑی۔

رامین بیٹا کمرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہو، جب سے یونیورسٹی سے آئی ہو کمرے میں گھس کر بیٹھی ہو باہر آؤ کھانا بن گیا ہے آ کر کھانا کھالو۔

جی جی امی آ رہی ہوں بس ایک کام بہت ضروری آن پڑا تھا وہ کر رہی تھی۔

وہ باہر آئی اور کھانا کھاتے ہوئے ماں سے کہنے لگی۔

امی مجھے اُردو ادب نہیں پڑھنا، میں کیوں کر رہی ہوں اُردو میں بی ایس؟؟ اس کی وجہ سے مجھے ہر جگہ تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی ہے اب اپنا مضمون بتاتے۔

ارے ارے یہ کیا بات ہوئی بیٹا اُردو ادب تو بڑا خوبصورت مضمون ہے سارے جہاں کا سلیقہ، شعار، محبت، امن اپنے اندر سموئے رکھتا ہے۔ اس کے لہجے کی شیرینی کو اس کے لفظوں سے چھلکتے ادب کے قرینے کو کون کہتا ہے اس کو بُرا بھلا؟ بتاؤ مجھے ذرا میں خود اُس جاہل انسان سے بات کروں گی۔ کیسا احساس کمتری اس ملک کے لوگوں کی رگوں میں دوڑنے لگا ہے اور جہالت تو دیکھو ان کی اپنی قومی زبان سے نفرت کرتے ہیں اپنی قومی زبان کو ہی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ قومی زبانیں تو اپنے اندر تہذیب و ثقافت کو جذب کر کے رکھتی ہیں قوموں کی یک جہتی اتحاد کا راز ہی قومی زبان کی ترقی میں مضمر ہے۔ چلو شاباش اب دھیان سے کھانا کھاؤ جہالت پر مبنی سوچ کان نہیں دھرتے، تم نے اُردو ادب پڑھنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بہترین ہے۔ اُس کی ماں میٹھے لہجے میں اُسے سمجھانے لگی۔

کھانا کھا کر وہ وہیں صوفے پر بیٹھی موبائل پر فیس بُک چلانے لگی ، ابھی اُس نے اپنی فیس بُک کھولی ہی تھی کہ فیس بُک پر ایک خبر گردش بڑے روز و شور سے گردش کر رہی تھی۔ کراچی کے علاقے نارتھ ناظم آباد میں ایک انگریزی سکول میں بچے کو اُردو زبان میں بات کرنے کی سزا دی گئی، بچے کے منہ پر کالک لگائی گئی اور پھر دوسرے بچوں کو اس کا مذاق بنانے کا کہا گیا۔

یہ خبر پڑھ کر اب وہ روئی نہیں پریشان نہیں ہوئی بلکہ اپنی قومی زبان کی اہمیت پر اپنی دوستوں کو ساتھ ملا کر سوشل میڈیا پر مہم چلانے لگی۔

اُس نے خود سے عزم کر لیا کہ وہ اب اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں نا صرف اپنا بلکہ اپنے شعبہ اُردو کا نام پوری یونیورسٹی میں متعارف کروا کر رہے گی۔ اور پھر یوں ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سوشل میڈیا پر نفاذ اُردو کے حوالے سے لوگ اس کی بات نا صرف سننے لگے بلکہ اس کی بات کو اہمیت بھی دینے لگے۔

ان ہی دنوں یونیورسٹی میں "ترقی کا راز قومی زبانوں کا نفاذ" کے نام سے ایک تین روزہ مکالماتی نشت کا انعقاد کیا گیا تھا۔ سوشل میڈیا پر اُس کی اُردو زبان کے حوالے سے سرگرمیاں دیکھتے ہوئے اُسے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے مدعو کیا گیا ۔ یہ خبر سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گئی اور بے چینی سے اُس دن کا انتظار کرنے لگی۔ بلآخر مکالماتی نشت کا آغاز ہوا پہلے دو دن پاکستان بھر کی جامعات میں سے پی ایچ ڈی ڈاکٹرز نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے آخری دن جرمنی، جاپان، چین کی جامعات سے پی ایچ ڈی ڈاکٹرز کو مدعو کیا گیا تھا ساتھ میں جامعہ والوں نے اپنے طلباء کو اُسی دن اپنی رائے کے اظہار کرنے کو کہا تھا جن میں رامین بھی شامل تھی۔ مکالماتی نشت کے سامعین میں

اُس دن جامعہ کے طلباء وطالبات بھی شامل تھے وہ اسٹیج پر آئی اور بولنے لگی۔

"آپ لوگوں نے وہ سامنے نظر آنے والا عمر رسیدہ برگد کا درخت دیکھا ہے جو دیکھنے میں غیر فانی اور ابدی محسوس ہوتا ہے نہ جانے کتنی مدت سے وہ تن وتنہا اور خاموش کھڑا ہے برقرار اور بیقرار، بے زبان بھی اور نغمہ زن، معلوم نہیں کتنی مرتبہ کڑکڑاتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کوہاسہ کی چادر ہٹا کر اس نے فریاد کی ہوگئی، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں اس نے آسمان کی طرف اُٹھائی ہیں۔ یہ اپنی مہربان شفیق چھاؤں میں ہر ایک کو بٹھانا چاہتا ہے مگر کوئی بھی اس کی چھاؤں میں بیٹھنا پسند ہی نہیں کرتا۔ یہ ہی حال ہماری ستر سال پرانی قومی زبان اُردو کا ہے کہ جس کے ساتھ کئی برسوں سے برتی جانے والی بے رخی نے اب موجودہ دور میں اُسے لاغر اندام بنا دیا ہے۔ یہ تو سب کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتی ہے مگر کوئی اس سے محبت نہیں کرتا، یہ اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں پر نوحہ کناں ہے کہ آخر کیوں اس کو سرکاری، دفتری، عدالتی اور تعلیمی زبان کے طور پر نافذ نا کیا گیا۔ قومی زبان اپنی قوم سے اپنے محافظوں سے ہر ایک سے سوال کرتی ہے کہ اس کو نافذ کرنے میں اتنی ہچکچاہٹ کیوں ہے۔ آخر یہ کب تک یوں ہی زبوں حال رہے گی۔"

ابھی وہ بول ہی رہی تھی پیچھے بیٹھا وہ ہی گروپ کہنے لگا، ارے محترمہ اُردو دان تم تو اپنا اُردو نامہ بند کرو دوسروں کو بھی بولنے کا موقع دو۔

وہ غیر ملکی مہمانوں کے سامنے اُن میں سے کسی کے منہ نہیں لگنا چاہتی تھی اور تہذیب کا تقاضا بھی یہ ہی تھا کہ وہ اپنی بات تو کہہ چکی تھی اب چپ چاپ اسٹیج سے اُتر جائے۔ اس کے بعد دوسرے ملکوں سے آئے ڈاکٹرز نے اپنی اپنی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا تو دوبارہ پیچھے سے ایک آواز بلند ہوئی سر انگریزی میں بات کریں ہمیں آپ کی زبان کی سمجھ نہیں آرہی ایسے میں پاس کھڑا مترجم اُردو زبان میں بولا

"یہ کہہ رہے ہیں قوموں کی ترقی کا راز قومی زبان کی ترقی وترویج میں پنہاں ہے"

اس بات پر شعبہ اُردو کے طلباء وطالبات کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگے۔

گونگا پاکستان

آمینہ یونس بلتستان

میں پاکستان ہوں۔ مجھے 14 اگست 1947 کو بہت قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا۔ مجھے حاصل کرنے میں لاکھوں جانوں کا خون شامل ہے۔ ہزاروں مائیں بیٹوں سے ہزاروں بہنیں بھائیوں سے بیویاں شوہروں سے محروم ہوئیں۔ تب کہیں جا کر ایک آزاد وطن میرے نام سے معرض وجود میں آیا۔ اسکی بنیادوں میں لا الہ الا اللہ کا نعرہ اور جزبہ ایمان کی طاقت شامل ہے۔ اس ایمان کے جذبے نے مسلمانوں کو نہ جانوں نہ مال و متاع کی اور نہ بنا بنایا گھر بار چھوڑنے کی فکر تھی۔ ان کو ایک آزاد وطن میں سانس لینے اپنے خدا کے آگے بے فکری کے سجدے کرنے کے علاوہ کوئی غم نہ تھا یوں قائدِ اعظم علامہ اقبال اور دیگر رہنماؤں کی ان تھک کوششوں سے مسلمانوں نے آخر کار آزادی حاصل کر لی۔ اور خوشی خوشی نعرہ تکبیر بلند کیا۔ پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ اللہ۔ اب نئے ملک میں نیا نظام قائم کیا۔ دفتر بنائے گئے۔ ایوان ترتیب دیا گیا۔ ان ایوانوں میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر حلف اٹھایا گیا۔ اور ایک اسلامی ریاست قیام میں لائی گئی۔ میں بھی بہت خوش ہوا ۔ کیونکہ مجھ میں رہنے والوں کی اکثریت اسلام ہے نماز ادا کرنے والے روزہ رکھنے والے تلاوت قرآن کرنے والے عدل و انصاف قائم کرنے والے میں خود کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں، کہ اللہ مجھ سے راضی ہے تبھی تو اسلام کو مجھ میں بسایا، جب کہیں سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے تو میں شکر ادا کرتا ہوں، جب عدل و انصاف کا بول بالا ہوتا ہے تو میں سجدہ ریز ہو جاتا ہوں، کہ مجھ میں رہنے والے کتنا اچھے اور با عمل مسلمان ہیں۔ شروع شروع میں سب ایمان دار اور وطن کا درد رکھنے والے لوگ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ وقت بدلنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ایمان اور یقین بھی کمزور ہوتا گیا۔ ہر چیز میں بے ایمانی پر اتر آئے۔ اردو جو ہماری قومی زبان ہے۔ ہم سب اس زبان سے ہی شرمندہ ہونے لگے۔ اردو کو قومی زبان بنانے کی بجائے انگریزی زبان کو ترجیح دینے لگے۔ ہر جگہ ہر دفتر ہر پیلیٹ فارم پر انگریزی بولنے لگے۔ جیسے ہم پاکستان میں نہیں، u k میں رہتے ہوں۔ اردو صرف شاعروں کی شاعری تک ادیبوں کے قلموں تک محدود کر دی گئی۔ اس پر ادب کے لوگوں کے پاس رونے کے سوا کچھ نہیں بچا۔ وہ کہتے رہیں قومی زبان کی اس حد تک بے حرمتی مت کریں' پر سنے والا کوئی نہیں۔ کچھ اور آگے چلا تو میں عقل آنے کی بجائے عقل سے پیدل ہونے لگا۔ ترقی کے بجائے تنزلی کی طرف بڑھتا گیا۔ ان سب کی وجہ ایمان کی کمزوری تقویٰ سے دوری نظام انصاف کا ختم ہونا ہے۔ دنیا کا گندہ ترین عدالتی نظام پاکستان کا عدالتی نظام ہے۔ پاکستان کا عدالتی نظام پاکستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

پاکستان کی عدالتیں چوروں ڈاکوؤں اور لٹیروں کی محفوظ پناہ گاہیں
بن چکی ہیں۔ جب کہ غریبوں کی پچیس سالوں میں بھی شنوائی
نہیں ہوتی۔ پاکستان میں معصوم بچیوں کو زیادتی کے بعد قتل
کرنے والے آزاد گھومتے ہیں۔ آج انٹرنیشنل کمیونٹی دیکھ رہی
ہے۔ کہ پاکستان کے اندر کوئی آئین، قانون، اور کوئی عدالتی
نظام موجود نہیں ہے۔ پاکستان کی بوسیدہ عدالتی نظام سے تنگ آ
کر باباجی فقیر گل نے صوابی کی عدالت میں فائرنگ کر کے اپنے
بیٹے کے قاتلوں کو قتل کر دیا۔ فقیر گل قتل نہ کرتا، تو کیا کرتا؟
پانچ سال پہلے دو افراد نے اس کے جوان بیٹے کو سب کے سامنے
قتل کیا۔ فقیر گل پیچھلے پانچ سال سے تھانے کچہریوں عدالتوں
کے چکر کاٹ رہا تھا۔ شدید سردی سخت گرمی میں بھی ذلیل وخوار
ہوتا رہا، ان کو عدالتی نظام میں انصاف کی امید اگلے دس سال
تک نظر نہیں آرہی تھی۔ تاریخ پہ تاریخ دی جاتی۔ اور ہر مہینے
عدالت کا ترازو ان کا مذاق اڑا رہا ہوتا۔ آج فقیر گل نے دونوں
قاتلوں کو عدالت میں گولی مار کر قانون اور انصاف کا مذاق اڑا
دیا۔ فقیر گل نے جو کیا عین پاکستانی قانون و آئین کے اندر کیا۔
کیونکہ جب عدالتیں تماشائی بن جاتی ہیں۔ اور آپ کو تحفظ
و انصاف نہ دے سکیں۔ تو یہ آپ کا حق ہے۔ کہ آپ اپنے لیے
انصاف اور اپنا حق چھین سکیں۔ کوؤں کی عدالت۔ حیوانات پر
جدید تحقیق کے مطابق کوؤں کے ہاں باقاعدہ عدالتی نظام
ہے۔ اور یہ عدالت کسی فرد یا جماعت پر ظلم کرنے نہیں دیتی۔
کوؤں کے نظامِ عدالت میں ہر جرم کی مخصوص سزا ہے۔ جیسے
، کوے کے بچے سے کھانا چھیننے کی سزا یہ ہے۔ کہ کوؤں کا ایک
گروپ اکھٹا ہو کر کھانا چھیننے والے کے پر نوچتے ہیں۔ یہاں تک کہ
وہ بھی بچے کی طرح اڑ نہیں پاتا، گویا ناک کے بدلے ناک کان
کے بدلے کان آنکھ کے بدلے آنکھ کا اسلامی قانون نافذ ہے
۔ اسی طرح گھونسلہ خراب کرنے اس کو گرانے یا اس پر قبضہ
کرنے کی سزا یہ ہے۔ کہ کوؤں کی وہ جماعت مجرم کو وہ گھونسلہ
دوبارہ بنانے پر پر مجبور کرتی ہے۔ یعنی بالکل عین اسلامی قانون پر
عمل کرتے ہیں۔ کسی دوسرے کوے کی جوڑی (بیوی) کوے کے
ساتھ غلط کاری یا ریپ کی سزا یہ ہے۔ کہ کوؤں کی ایک جماعت
مجرم کو چونچ مار مار کے قتل کر دیتی ہے۔ ماہرین کے مطابق کوؤں
کی عدالت لہلہاتے کھیتوں اور کھلے میدانوں میں لگتی ہے۔ یعنی
کسی بند کمرے میں نہیں، مقررہ وقت پر کوے اکھٹے ہونا شروع ہو
جاتے ہیں۔ اور جج بیٹھ جاتے ہیں۔ ملزم کوے کو لایا جاتا ہے۔
عدالتی کارروائی کے دوران ملزم کو اسر جھکائے پر پھیلائے انتہائی
سیکورٹی میں عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور اپنے جرم کے
اعتراف میں کائیں کائیں بند کر دیتا ہے۔ یعنی خاموش رہتا
ہے۔ جب عدالت کسی کوے کو سزائے موت سناتی ہے۔ تو
سیکورٹی پر مامور کوے اس مجرم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور چونچ
مار مار کر اس کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو ایک کوا اپنے
چونچ سے اٹھالیتا ہے۔ اور اس کو دفنانے کے لیے لیے جاتے ہیں
۔ پھر اس کے جسم کے برابر قبر کھود کر اس کو دفناتے ہیں۔ اور
مکمل احترام سے اس پر مٹی ڈال دیتے ہیں۔ یوں کوؤں کو اللہ کا
عدل معلوم ہے۔ اور انھوں نے اس کو نافذ کیا ہوا ہے۔ مگر
افسوس انسان پر صد افسوس، جو اللہ کے قانون کی بجائے خود

ساختہ قانون کے ذریعے حکومت کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "زمانے کی قسم انسان نقصان میں ہے۔" کیا پاکستان جس کو لاکھوں جانوں کا نذرانہ دے کر کلمہ حق کے نام پر بنایا گیا تھا۔ کے بااثر اور تعلیم یافتہ لوگ کوے کے برابر بھی عقل نہیں رکھتے؟ حالانکہ کوا گندگی کھا کر بھی اتنا عقلمند ہے!! پاکستان کے لوگ آخر کھاتے کیا ہیں؟ احتجاج کا حق رکھتے ہوئے بھی لوگ سوئے رہتے ہیں۔ چاہے اوپر سے جس طرح سے گزرنا چاہے گزر جائے۔ جب ووٹ قریب آتے ہیں۔ تو سیاست دان عوام کو بے وقوف بنا کر حاصل کرتے ہیں۔ ووٹ حاصل کرنے کے بعد ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھتے، پھر عوام بے چارے پانچ سال تک ان کی زیارت کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ جب دوبارہ الیکشن آتا ہے تو سیاست دان پھر سادہ لوح اور بے زبان عوام کو مختلف پیں تروں کے ذریعے پھر سے خالی وعدوں قسموں سے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور بے چارے عوام سر پیٹ کر وعدوں کے سہارے پھر پانچ سال کے لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔ غریب عوام کو کبھی مذہب کے نام پر لوٹا جاتا ہے۔ تو کبھی حقوق کے نام پر جو کبھی بھی ملا نہیں ہے اور نہ ملنے کی امید ہے۔ کبھی روٹی کپڑا اور مکان کے دھوکے میں، عوام نے بھی قسم کھار کھا ہی۔ کوئی کچھ بھی کریں۔ زبان نہیں کھولنی ہے۔ پولیس کے ہاتھ لگ جائے تو ردی اٹھانے والے کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔ ہسپتالوں میں جاؤ تو ڈاکٹر کے دروازے پر رہنے والی جو اس کی جیب بھرتا ہے۔ یا کوئی خوبصورت جوڑا لے آئے گی تو وہ پہلے ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ جو غریب بے چارہ ہوتا ہے۔ وہ انتظار میں ہی رہ جاتا ہے۔ ایک مہنگائی اتنی کہ غریبوں کی کمر ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ اوپر سے اوپر سے نیچے تک معمولی بھی کام کے لیے ہاتھ دیکھانا پڑتا ہے۔ ملک ترقی کرے تو کیسے؟ لوگ رحم دل کس طرح ہونگے۔ جو ملے کھاتے جائے تو، اب تو 14 اگست کو بھی خود کے 14 اگست ہونے پر افسوس ہوتا ہوگا۔ کوئی حق کے لیے آواز اٹھائے تو اتنی بے دردی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس آواز میں آواز ملانا چاہے تو بھی نہیں ملا سکتے۔ حق کے لیے آواز اٹھائے تو ایسے لاپتہ ہو جاتے ہیں۔ کہ گھر والے تڑپتے بلکتے رہ جاتے ہیں۔ غرض پاکستان میں بے ایمانی ہر برے کام کرتے جاتے ہیں۔ اور روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور نہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا ہے۔

۔۔ ہم اپنے اہل سیاست کے دل سے قائل ہیں

کہ حق میں قوم کے وہ مادر مسائل ہیں

قدم قدم پہ نئے گل کھلاتے ہیں

طرح طرح کے مسائل اگاتے ہیں

کبھی یہ دھن ہے کہ صوبوں کی پھر سے ہو تشکیل

کبھی یہ ضد ہے کہ حد بندیاں نہ ہوں تبدیل

گونگا پاکستان

عمران خان، مالاکنڈ

احمد آج سکول سے غیر حاضر تھا۔ رستے میں اپنے شفیق استاد سے ملا۔ استاد نے وجہ پوچھی تو کہا کہ آج اپنے دادا سے کھیتوں پر کام کرنے گیا تھا۔ احمد کے استاد بھی اسی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ احمد سے کہنے لگا پنجم کا امتحان قریب ہے اور آپ نے اپنے کلاس کی پہلی پوزیشن اپنے گاؤں میں لانا ہے کیوں کہ اس سے پہلے پوزیشن بھی ہمارے گاؤں کے طلبہ نے حاصل کی ہے۔ احمد نے کہا ٹھیک ہے استاد جی!

احمد ایک ذہین طالب علم تھا لیکن وہ نمبر اور پوزیشن حاصل کرنے کی ڈور میں کسی سے مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ وہ کوئی بھی سوال رٹا لگا کر یاد نہیں کرتا۔ وہ اپنے کلاس کا مانیٹر بھی تھا۔ پنجم کا امتحان ہوا تو اس نے پھر بھی پہلی پوزیشن اور یونین کونسل کے سکولوں میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

پنجم پاس کرنے کے بعد ہائی سکول میں داخلہ لینے کا وقت آیا تو پرائمری کے اسی استاد نے کہا کہ میرے اک دوست جو نجی سکول کا پرنسپل ہے آپ کو اپنے سکول میں داخل کرانا چاہتا ہے تمھارا داخلہ فیس اور کتب وغیرہ کا فیس نہیں لیا جائے گا ۔

احمد کے ایک دوست نے اس سے کہا کہ پرائیویٹ سکول میں داخلہ لو وہاں اچھی تعلیم ہوتی ہے۔ احمد دیہاتی علاقے میں رہتا تھا اور دیہات میں خالص مادری زبان بولی جاتی ہے۔ احمد کا دل بھی کرتا تھا کہ وہ اچھی جگہ تعلیم حاصل کرے لیکن اسے ایک خوف تھا۔ اس نے سنا تھا کہ نجی سکول میں کتابیں انگریزی میں ہوتی ہے جس کا سمجھنا ایک دیہاتی بچے کے لئے ناممکن تھا۔ احمد اپنے دوست سے کہتا ہے کہ پرائیویٹ سکولوں میں امیروں کے بچے پڑھتے ہیں۔ ان کی کتابیں مشکل ہوتی ہیں۔ ان کو گھر میں بھی استاد پڑھانے آتا ہے۔ احمد ہر حال میں سرکاری سکول میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ انگریزی زبان کے بوجھ سے بچ سکے۔

احمد نے سرکاری سکول میں داخلہ لیا اور سکول جانے لگا۔

ذہین ہونے کے ساتھ احمد کی خوبی تھی وہ استاد کی سبق کو بڑی توجہ سے سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ احمد کو سوال رٹنے کی عادت بالکل نہیں تھی وہ جو بات جس طرح سمجھ پاتے اپنے الفاظ میں لکھ دیتے۔ نوماہی امتحان کے دوران ایک استاد نے

احمد کے دو پرچے دیکھنے کے بعد کافی تعریف کی کیونکہ وہ رٹا رٹایا سوال نہیں لکھتے بلکہ اپنے الفاظ میں لکھ دیتے تھے۔

احمد کو کلاس میں ایک مسئلہ تھا کہ جب بھی انگریزی کا ٹیسٹ یا پرچہ ہوتا اسے اس کے سوالات رٹا لگا کر یاد کرنے پڑھتے۔ یہ اس کا پہلا ذہنی آزیت دینے والا تجربہ تھا۔

وہ بمشکل اپنے انگریزی کا ٹیسٹ اور پرچہ پاس کر لیتا۔

جوں جوں احمد اگلے کلاسوں میں جاتا رہا انگریزی کا مضمون اس کے لیے تعلیم سے اکتاہٹ پیدا کرتا رہا۔۔ ایک دن احمد کے والد جو ان پڑھ اور غریب خاندان سے تھے، احمد سے کہنے لگے کہ سکول سے کچھ نہیں بنتا تمھارے لئے دو چار بکریاں خرید تا ہوں پہاڑوں میں چرا کر اس کے بچے بیچیں گے اور پیسے کمائیں گے۔ احمد بھی دل ہی دل میں خوش ہوا کہ چلو انگریزی سے تو جان چھوٹے گی۔ لیکن احمد کے ایک چچا سکول میں پڑھاتے تھے۔ جب احمد کے سکول چھوڑنے کی بات آتی تھی تو اس کے چچا اسے سکول نہ چھوڑنے دیتے اور یوں احمد کی تعلیم جاری رہتی۔

میٹرک میں پہنچ کر احمد کے بورڈ کے امتحان ہونے لگے اس نے ابتدا سے امتحان سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن اسے فکر صرف انگریزی کے پرچے کی رہتی تھی ۔ کیوں کہ بورڈ کے امتحانات سکول کے امتحان سے مختلف ہوتے ہیں۔ اخر کار احمد نے سوالات رٹنے کی بجائے نقل سے لکھنے کی ٹھانی اور ذہنی کوفت اٹھانے کی بجائے نقل سے لکھنے کو ترجیح دی۔ احمد جو نقل سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ ایک دن وہ اسلامیات کے اک سوال کے بارے میں نہیں جانتے تھے امتحانی ہال میں کسی سے جواب سنا تو پرچے میں نہیں لکھا، اس لئے کہ یہ تو میں نے دوسرے طالب علم سے سنا، یہ تو بے ایمانی ہے۔

اتنا اصول پرست انسان اپنے اصول توڑ کر انگریزی سے مات کھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور انگریزی کے پرچے میں نقل سے سوالات حل کر کے پرچہ پاس کرنے لگ جاتا ہے۔ احمد نے بورڈ کے امتحان میں انگریزی میں کچھ رٹے رٹایے سوال اور کچھ نقل کر کے پاس کیا جبکہ باقی مضامین میں اچھے نمبر حاصل کر کے کامیاب ہوا۔

جب کالج میں داخلہ لینے کا وقت آیا تو ریاضی میں احمد کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اک تعلیم یافتہ دوست نے احمد کو تاکید کے ساتھ انٹر سائنس میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا اور اسے مضامین کے بارے میں معلومات بھی دیں۔ احمد نے ایک مخلص دوست کے مشورے کو رد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور انٹر سائنس میں داخلہ لیا۔

جب احمد کلاس لینے لگا تو مضامین اس کے قابلیت کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے لیکن مسئلہ انگریزی کا تھا۔

احمد نے سرکاری سکول سے میٹرک کیا جہاں ذریعہ تعلیم اردو تھی اور اب کالج میں سائنسی مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ احمد کے لئے اپنی پسند کے مضامین پڑھنا بھی انگریزی میں ممکن نہیں تھا۔ اسے پھر یہ خوف کھانے لگا کہ امتحان میں انگریزی میں پرچے کیسے حل کروں گا۔ اس نے اپنے اک

دوست سے مشورہ کیا کہ میرے لیے انگریزی میں سائنسی مضامین پڑھنا ممکن نہیں اب میں کیا کروں؟ دوست نے کہا کہ پھر تم ایسا کروں کہ اپنا گروپ تبدیل کروں اور آرٹس گروپ میں داخلہ لو۔

احمد کو اپنے دوست کا مشورہ اچھا لگا اور نقل سے پاس ہونے کی بجائے آرٹس میں داخلہ لینے کو ترجیح دی۔

اسی طرح احمد نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور بی۔اے تک جا پہنچا۔ یہاں تک پڑھنے میں انگریزی کا جو بھی پرچہ ہوتا وہ اپنے اصولوں سے انحراف کر کے کچھ نقل، عقل اور رٹا ہوا علم ملا کر پاس کرتے۔ انگریزی کا مضمون پڑھنا چونکہ لازمی تھا اسی لیے اس سے جان چھوٹنا مشکل تھا۔بی-اے میں انگریزی کا پرچہ پانچویں کوشش کے بعد انتہائی کم نمبروں سے پاس کیا۔

بی۔اے کے بعد احمد ایک دلی خوشی اور ذہنی سکون محسوس کرتا جب وہ سوچتا کے ایم کے امتحان میں انگریزی کا مضمون شامل نہیں ہوتا۔

احمد نے اسلامیات میں ایم اے کرنے کے بعد سکول میں اساتذہ کی تقرری کے لئے ٹسٹ دیا جو اس نے پہلی کوشش میں اچھے نمبروں سے پاس کیا اور سکول میں مدرس کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔

محکمہ تعلیم میں رہتے ہوئے اس کا تعلق پڑھے لکھے لوگوں سے قائم ہوا۔ وہ نظام تعلیم کے بارے بحث مباحثے کرتے رہتے۔ نظام تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں پر آزادانہ رائے دیتے اور سنتے۔

احمد جہاں نظام تعلیم میں دوسری خامیوں کا ذکر کرتے وہاں انگریزی ذریعہ تعلیم کبھی نظرانداز نہیں کرتے اور اور سب سے مقدم رکھتے کیونکہ اس کا اسے خود ایک دردناک تجربہ ہوا تھا۔

ایک مرتبہ اساتذہ کی ایک تربیتی پروگرام میں اپنے سہولت کار مدرس (ٹرینر) سے انگریزی ذریعہ تعلیم پر بحث چھڑی۔ سہولت کار مدرس نے انگریزی میں اعلیٰ ڈگریاں لی تھیں اس لیے وہ انگریزی ذریعہ تعلیم کے حق میں دلائل پیش کر رہے تھے۔ احمد کو چونکہ ابتدائی تعلیم سے انگریزی کی وجہ کافی مشکل اور ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے اپنے ٹرینر سے اختلافی رائے رکھتے تھے۔ جس پر ٹرینر نے کہا کہ انگریزی سائنس کی زبان ہے اگر ہم انگریزی نہیں سیکھیں گے تو ہم سائنس کی تعلیم حاصل نہیں کر پائیں گے۔

احمد نے کہا کہ جناب! میں انگریزی زبان سیکھنے کے خلاف نہیں ہوں، زبانیں سیکھنا بھی اک علم ہے، لیکن ہم دوسری زبانوں سے وہی سائنسی علوم ترجمہ کر کے اپنی زبان میں پڑھانا چاہیے۔

ٹرینر نے پھر کہا کہ ہمارے زبان میں ایسے الفاظ نہیں ہے جو ان سائنسی ناموں کے متبادل ہوں جو ہم انگریزی میں استعمال کرتے ہیں۔

احمد نے کہا کہ کیوں نہیں ہے اگر ہم کوشش کریں۔

ٹرینر نے کہا اچھا موبائل کے لئے اردو میں کونسا لفظ استعمال کریں گے۔

احمد نے کہا ضروری نہیں کہ ہر لفظ کو اپنی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اردو کو دیکھے تو اس میں دوسری کئی زبانوں کے الفاظ ہیں ۔سکول ڈاکٹر، ٹریکٹر، ہسپتال وغیرہ بہت سارے الفاظ ہے جو انگریزی کے ہیں لیکن ایک ان پڑھ بھی اس کا معنیٰ و مطلب جانتا ہے۔ اس کے بعد احمد نے ٹریزر سے سوال پوچھا کہ سائنس کس زبان کا لفظ ہے؟ ٹریزر نے کہا لاطینی زبان کا۔ احمد نے کہا کہ جب لاطینی لفظ کو انگریزی میں استعمال کرنے سے مسئلہ نہیں بنتا تو اردو میں انگریزی کے ایک آدھ لفظ استعمال کرنے سے بھی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا۔۔ اور یہ نہیں بلکہ جتنے سائنسی اشیاء (دھاتوں) وغیرہ کے نام ہیں ان میں آدھے سے زیادہ لاطینی زبان کے ہیں جو انگریزی میں استعمال ہوتے ہیں۔۔

ہم سنتے ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں بھی ہے کہ ایک ہزار سال تک مسلمان سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں اور دنیا اس کی معترف ہے۔ مسلمانوں کی زبان عربی تھی۔ جب سائنسی علوم مغربی ممالک نے اپنانا چاہا تو اس نے عربی زبان کو اپنے اوپر مسلط نہیں کی بلکہ عربی کتب کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور مسلمانوں سے آگے نکل گئے۔

آخر میں احمد نے اپنی بات کو اور مضبوط بنانے کے لیے کہا کہ ہم عربی نہیں جانتے بلکہ عربی میں ایک جملہ بھی نہیں کہہ سکتے اور ہماری دینی تعلیمات عربی زبان میں ہیں۔ ہم پھر بھی اپنے دین کے بارے میں کسی حد تک علم رکھتے ہیں یہ اس وجہ سے نہیں کہ ہم نے عربی سیکھی بلکہ اک مخصوص طبقے نے سیکھی اور پھر ہمیں اپنی زبان میں دین سمجھایا۔

احمد کی باتیں زیادہ طویل ہونے پر اس کا ایک دوست اسے بیٹھنے کا اشارہ کر دیتا ہے کہ تمھاری بات ٹھیک ہے اتنی حد تک اپنے ٹریزر کو لاجواب کرنا مناسب نہیں۔۔ احمد کی بات کی حمایت کلاس میں موجود اکثر شرکاء کرتے ہیں۔

احمد نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا اور کلاس ختم ہونے پر گھر کی طرف روانہ ہوا۔

گھر جا کر شام کو ٹی-وی دیکھنے بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر بجٹ کی کاروائی پیش ہو رہی تھی۔ اک پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کا ممبر بھی یہ شکوہ کر رہے تھے کہ بجٹ کی تفصیلاتی کتابچہ انگریزی زبان میں ہیں ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ ہم اس پر کیا رائے دے سکتے ہیں؟ انگریزی کو ہم پر کیوں مسلط کیا جاتا ہے۔ اردو میں کیا مسئلہ ہے؟ کیا ہم یہ کتابچہ اردو میں چھاپ نہیں سکتے؟ تاکہ ہمیں بھی سمجھ آسکے۔

احمد ایسے اکثر مواقع پر حیران ہو جاتا ہے کہ جو ذمہ دار لوگ ہیں انہیں کیوں اس بات کا احساس نہیں ہو رہا کہ قوم کے بچوں پر انگریزی زبان مسلط کر کے ان کے تخلیقی صلاحیتوں کا قتل کیا جا رہا ہے، ان کو گونگا رکھا جا رہا ہے۔ لوگ کیوں اردو زبان کی حمایت میں آواز نہیں اٹھاتے۔۔ شاید اس بات کو احمد اس لیے انتہائی حد تک محسوس کرتا ہے کہ یہ اس پر گزری تھی، یا احمد کے ہم خیال لوگ ہی اس بات کو محسوس کر سکتے ہیں۔

گونگا پاکستان   علی رضا   فیصل آباد / دبئ

1857 سے پہلے میں ایک مشترکہ وجود کا حصہ تھا۔ گو کہ میری کوئی الگ سے پہچان نا تھی لیکن میں ہنستا تھا, میں بولتا تھا۔ میں ہمیشہ چہل پہل کا مرکز رہتا تھا۔ پُررونق محفلوں کا مسکن رہتا تھا۔

1857 کے بعد انگریز ہمارے مشترکہ وجود پر قابض ہو گئے تو انہوں نے ہماری چہل پہل, رونقیں, محفلیں غیر محسوس انداز میں چھیننا شروع کر دیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں بول تو رہا ہوں لیکن میرے بولنے پر اب اعتراض اٹھنے لگے۔

بس بہت سارے دوسرے اہم محرکات کے ساتھ ساتھ میری زبان بھی میری علیحدگی کا ایک بہت بڑا محرک بنی۔ کیونکہ میں اسلام کے نام پر بن رہا تھا تو میری گفتار میں بھی اس کی جھلک نظر آنی چاہیے تھی۔

1947 کو میں مشترکہ وجود سے الگ ہو کر اپنی ذاتی حثیت میں جانا جانے لگا۔ میں بہت خوش تھا کہ اب میں آزاد ہوں, خود مختار ہوں, پابند سلاسل سے نکل آیا ہوں اب میں خوب بولوں گا لیکن !!!!!!!!

میں بھول گیا تھا کہ اب میں جن افراد کے تسلط میں ہوں وہ کون ہیں, وہ کس نظام سے آئے ہیں, انکی پرورش کہاں ہوئی ہے ؟؟؟ پہلے تو مجھے صرف محسوس ہوتا تھا کہ میرے بولنے پر اعتراض اٹھتے ہیں, میری پہچان چھپائی جاتی تھی۔ اب میری پہچان تو ہے, میری بولنے پر اعتراض تو نہیں اٹھتے لیکن اب مجھے گونگا کر دیا گیا ہے۔ گونگا پاکستان

میری قومی زبان اردو ہے لیکن میرے تمام اداروں میں ترجیح انگ ریزی کو دی جاتی ہے۔ میرے ملک کے منصف اپنے تمام فیصلے اس زبان میں لکھتے ہیں جس کو جاننے والے 5 فیصد بھی نہیں بنتے۔ میرے مدارس, جامعات کا نصاب انگ ریزی میں بنایا جاتا ہے, میری قوم کے بچوں کو ترقی کی علامت انگ ریزی بتایا جاتا ہے کیونکہ مجھے گونگا بنا دیا گیا ہے۔

کہیں کبھی کوئی اگر میری چپ پر سوال اٹھاتا بھی تھا اس کی سنوائی ہوتی تھی۔ لیکن اب میری زبان بندی کے حق میں با قاعدہ دلائل دیے جاتے ہیں۔ میرے بولنے کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ گردانا جاتا ہے۔ کیونکہ میری جبری چپ کو نسل نو نے پیدائشی گونگا سمجھ لیا ہے۔

مجھے گونگا بنانے اور بتانے میں اکثر میرے ملک کے دانشوروں اور ایک مخصوص طبقے کے لوگوں نے زیادہ کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنا اوڑھنا, پہننا, چلنا پھرنا کچھ

اس انداز سے انگ ریزی میں ڈھالا ہے کے اوسط اور نچلے درجے کے لوگ اسی انداز کو معیار زندگی, ترقی و خوش حالی سمجھ بیٹھے ہیں۔

میرے ملک کے اساتذہ نے نسل نو کو اپنے واعظوں اور ناکامیوں سے اس قدر پختہ ذہن کر دیا ہے کہ نوجوان نسل کو لگتا ہے کہ سائنسی و معاشی ترقی کا حل صرف اور صرف اس گونگے پن سے جان چھڑانا ہے۔ لیکن افسوس کے وہ بچے, وہ نسل جس نے بولنا سیکھنا تھا, جس نے میری آواز بننا تھا, جس نے مجھے پھر سے قوت گویائی بخشنی تھی وہ اندھی تقلید میں نا گونگے رہے نا ہی خوش کلام بلکہ وہ بیچارے مانگے کی زبان میں ہکلانے لگے۔ میری قوم کے ہکلانے پر ترقی ہوئی یا نا ہوئی جگ ہنسائی ضرور ہونا شروع ہو گئی۔

ہمارے مدارس و جامعات سے ہر سال ہزاروں سینکڑوں اعلی تعلیم یافتہ مہندس, سائنسدان ہکلاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ شاید میں اب گونگا ہونے کے ساتھ ساتھ اندھا بھی ہوتا جا رہا ہوں۔ بجلی کی کمی آج تک ان ہکّلوں سے پوری نا ہو سکی۔ مجھے لگتا ہے اب میں گونگا ہونے کے ساتھ بہرا بھی ہوتا جا رہا ہوں کیونکہ میرے ملک کی جامعات سے ہر سال ہزاروں سینکڑوں ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد ہکلاتے ہوئے نکلتے ہیں لیکن غریب, مزدور, ضرورت مند کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی۔

نہیں نہیں میں گونگا نہیں ہوں, میں پاکستان گونگا نہیں ہوں میری پہچان بھی ہے اور میری آواز بھی اور میری زندہ زبان بھی موجود ہے۔ ہاں لیکن یہ قوم, یہ معاشرہ, یہ تہذیب گونگے ہو چکے ہیں, یہ اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں جو ہکلاتے ہوئے اندھا دھند بھاگتے ہیں, انگ ریزی کے پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہیں اور پھر سے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ کیوں بھاگ رہے ہیں, ان کی سمت کیا ہے, ان کا مقصد کیا ہے ان میں سے کسی کو کچھ نہیں پتہ, بس دوڑ ہے ہکلانے کی۔ جب یہ ہکلاتے ہکلاتے تھک جائیں گے ہڈیاں کمزور ہو جائیں گی تب گھر کے کسی انجانے کونے میں بیٹھ کر پچھتا رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کاش اس ہکلانے کی بجائے کسی گونگے کی پکار سنی ہوتی لیکن تب دیر ہو چکی ہو گی

گونگا پاکستان.......نوید انجم سوات

نعیم صاحب جب شام کو گھر لوٹا تو ہر کوئی اسے مبارکباد دے رہا تھا؛ اس لیے کہ اس کا بیٹے جواد کو نوکری مل گئی تھی، وہ کالج میں انگریزی کا پروفیسر لگ گیا تھا۔ نعیم صاحب نے اس خوشی کے موقع پر خدا کا شکر ادا کیا اور جواد کو گلے سے لگایا اور مارے خوشی کے خوب رویا۔

نعیم صاحب کسی سرکاری دفتر میں کلرک کی حیثیت سے اپنے خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا اس سے بھی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر خوب توجہ دی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اس کا یہ خواب پورا ہو گیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دلوائی تھی۔ جواد چونکہ خود بھی ذہین تھا، اس لیے اس نے دینی علوم میں پرائیوٹ ڈگری حاصل کر رکھی تھی اور انگریزی کے علاوہ اس کو دینی علوم پر کافی دسترس حاصل تھا۔

کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے وہ اپنے خدمات سر انجام دینے لگا اور ساتھ ساتھ باہر کے ممالک میں بھی اپلائی کرتا رہا، تاکہ اسے باہر کے ملک میں اچھی خاصی جاب مل جائے۔ اس کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور آخر کار اسے مغرب ممالک میں سے ایک ملک کی مشہور یونیورسٹی سے پیشکش ہوئی کہ وہ وہاں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرے۔ جواد بہت خوش تھا۔ نعیم صاحب نے اسے لاکھ منع کیا کہ اس کی اپنی ملک میں نوکری ٹھیک ہے لیکن جواد کے سر پر باہر جانے کا بھوت سوار تھا۔ کچھ مہینوں بعد جواد اپنا ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

مغرب جا کر جواد محنت اور لگن سے اپنے خدمات سر انجام دینے لگا۔ اس کو چونکہ دینیات پر بھی کافی دسترس حاصل تھی، اس لیے فارغ وقت میں وہ اپنے دین کے بارے میں وہاں کے طالب علموں کو بتاتا اور انہیں اپنے دین سے آگاہ کرتا۔ جواد کی قابلیت کی حد یہ تھی کہ اس یونیورسٹی میں اس کی منہ سے اسلام کے بارے میں سن کر چند لڑکوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جواد کے لیے یہ بڑی سعادت کی بات تھی۔ اس کے بعد بہت سے طالب علم جواد کی باتوں اور علومِ اسلامی سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس بات کا جب یونیورسٹی کے اعلیٰ حکام کو پتا چل گیا تو انہوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی کہ جواد کے بارے میں معلومات حاصل کریں کہ آخر وہ کون ہیں اور یہاں کس مقصد سے آیا ہے۔ کمیٹی نے شک کی بنا پر اسے جاسوس قرار دے دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ کسی اسلامی تحریک کا نمائندہ

ہے۔ لہٰذا جواد کے خلاف قانونی کارروائیاں شروع ہو گئیں اور صرف شک کی بنا پر اسے یونیورسٹی سے نکال کر سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ جواد نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کسی نے بھی اس کی ایک نہ سنی۔

ادھر نعیم صاحب کو تشویش لاحق ہوئی کہ کافی عرصہ ہو گیا اور جواد نے فون پر کوئی رابطہ نہیں کیا۔ نعیم صاحب کے صبر کا پیمانہ جب لبریز ہو گیا تو اس نے سفارت خانے کا رخ کر لیا۔ وہاں اپنے بیٹے کے بارے میں معلومات کیں تو اسے بتایا گیا کہ اس کا بیٹا انتہا پسند تحریک میں ملوث ہے اور اسے جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ نعیم صاحب سکتے میں پڑ گئے کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے سفارت خانوں کی خاک چھان ماری لیکن اس کی ایک بھی نہیں سنی گئی۔ نعیم صاحب بے بس اور بے یار و مددگار نا امید ہو کر گھر لوٹتا تھا۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ جواد کا کچھ پتا نہ چلا۔ نعیم صاحب کی بھی ہمت جواب دے گئی تھی۔ ایک دن نعیم صاحب گھر لوٹ رہا تھا اور اس کے ذہن میں یہ جملے گردش کر رہے تھے: "آخر میرے بیٹے کا قصور کیا تھا؟ وہ تو اپنے ملک کا نام روشن کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ کیا اس کا اپنا وطن اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا؟ کیا وہ اس وطن کا بیٹا نہیں ہے؟ کیا میرا وطن اتنا کمزور ہے کہ اس کی کوئی سنتا ہی نہیں؟ کیا پاکستان گونگا ہے جو میرے بیٹے کو چھڑانے کے لیے کسی سے بات تک نہیں کر سکتا؟۔۔۔؟ ہاں! پاکستان گونگا ہے۔ وہ صرف تماشا دیکھ رہا ہے کہ باہر اس کے بیٹے پر کیا کیا ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ ہاں! پاکستان گونگا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو واپس لینے کی خاطر کسی کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔۔۔"

نعیم صاحب کا سر چکرا گیا اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اس کے قتل کا ذمہ دار اس کا اپنا ملک تھا۔ وہ کبھی نہ مرتا اگر اس کے ملک نے اس کے بیٹے کو واپس لانے میں اس کا ساتھ دیا ہوتا۔۔۔ جواد کی بے گناہ ہونے کا ثبوت بھی اس کا ملک فراہم نہ کر سکا۔ کیسے کرتا۔۔۔؟ اس کا ملک تو گونگا تھا۔ دونوں باپ بیٹے اپنے ہی وطن کے گونگے پن کی وجہ چل بسے۔ باپ مر گیا اور بیٹا جیتے جی مر گیا۔

کاش! اُن کا ملک اپنے ایک بیٹے کی خاطر کچھ کر سکتا۔ کاش! ان کا ملک پاکستان اتنا کمزور نہ ہوتا۔ کاش! ان کا ملک اتنا ترقی یافتہ ہوتا کہ لوگ باہر کے ممالک جانے کی خواہش نہ رکھتے۔ کاش۔۔۔!

گونگا پاکستان

تحریر: علیزے خان، کراچی

ہاشم پریشانی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور اسکی بیوی ریحانہ بیڈ پہ بیٹھی آنسو بہانے میں مصروف تھی

"تم رونا تو بند کرو، پہلے ہی پریشانی کے باعث میرا ذہن ماؤف ہو رہا ہے اوپر سے تمھارا رونا پیٹنا بند نہیں ہو رہا"

ہاشم ناگواری سے بولتے ہوئے صوفے پہ بیٹھا۔

"مجھے بتائیں! میرا کیا قصور ہے؟ اتنی مشکل سے گھر کا خرچ بچا کے اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر اپنی جائز ضروریات تک کو کچل کر ہم نے یہ فلیٹ قسطوں پر خریدا تھا، مگر اس میں بھی ہم سے دھوکہ ہو گیا، ہم کہاں جائیں کس سے فریاد کریں؟" ریحانہ نے روتے ہوئے شکوہ کیا،

بات اسکی بھی صحیح تھی مگر ہاشم بے بسی سے سر پکڑ کر بیٹھنے کے سوا کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا

ہاشم ایک فیکٹری میں اپنے شعبے کا نگران تھا، اور اسکی مناسب سی تنخواہ تھی جس سے اسکی بیوی نے کچھ کمیٹیاں ڈال رکھی تھی، انکی وصولی اور بیوی کا زیور بیچنے کے بعد جب ان کے پاس کچھ معقول رقم جمع ہو گئی تو انہوں نے ایک مشہور رہائشی اسکیم میں اپنا فلیٹ خریدنے کے لئے بیانہ جمع کروا دیا اور ہر ماہ اسکی قسط وہ اپنی تنخواہ سے ادا کر رہا تھا، جس سے ان کا مہینے کا حساب بہت درہم برہم ہو گیا تھا، ان کے دو بچے بھی تھے ان کی اسکول اور ٹیوشن کی مشاہرے، اس کمر توڑ مہنگائی میں پیٹرول اور بجلی گیس کے بل پورے کرتے کرتے ایک غریب آدمی پورا ہو جاتا مگر اخراجات پورے کرنا ناممکن ہو رہا تھا، اسکی بیوی مہنگائی کے اس حملے سے نپٹتے اپنے شوہر کے شانہ بشانہ کھڑی تھی، وہ گھر میں سلائی کا کام کر لیتی تھی جس سے وہ گھر کا کرایہ ادا کر دیتے اور روز کی دال سبزی جیسے تیسے پورے کرنے کی کوشش کرتے، ان کا خواب اپنا گھر وہ اپنے اور اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ ان کے بچوں کا مستقبل محفوظ ہو سکے اور ان کو بھی کرائے کے گھر سے چھٹکارا ملے جس میں ہر سال اضافہ ایک معمول کی بات تھی

فلیٹ کی چھٹی قسط بھرنے کے بعد ایک دن اچانک انہیں رہائشی اسکیم کے دفتر سے ایک لفافہ ڈاک کے ذریعے موصول ہوا جس کے مندرجات انگریزی میں تھے، ہاشم نے سرکاری اسکول و کالج سے بارہ جماعتیں جیسے تیسے کر کے پاس کی تھیں یہ بس وہی جانتا کیونکہ وہ انگریزی کے پرچہ میں بار بار ناکام ہوتا وجہ صرف اسکی انگریزی بہت کمزور تھی اخر بورڈ نے اسے رعایتی نمبر دے کر 33 نمبر سے اسکا انگریزی کا

پرچہ پاس کر دیا جس کے بعد وہ اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ مزید تعلیم سے ہی توبہ کر کے مقامی فیکٹری میں بھرتی ہو گیا تھا، مگر انگریزی اب بھی بھی بار بار اس کی راہ میں روڑے اٹکانے سامنے آجاتی، کیونکہ اس ملک کی قومی زبان تو اردو تھی مگر دفتری زبان انگریزی، اور الف سے یے تک تمام تر دفتری دستاویزات اس قدر مشکل انگریزی میں ہوتے جن کا پڑھنا ایک معمولی تعلیم یافتہ کے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ،وہ اٹک اٹک کر پڑھ تو لیتا مگر مکمل مفہوم سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا کبھی کبھی، اور پھر لوگوں کے طعنے الگ شرمندہ کرتے کہ کیا پڑھا لکھا تم نے اتنے عرصے اسکول و کالج میں، لہذا وہ شرمندگی سے بچنے کے لئے یوں ہی ظاہر کرتا کہ جیسے وہ سب پڑھ سکتا ہے مگر اس کی یہ عادت اسے اسوقت مہنگی پڑ گئی تھی ،کیونکہ فلیٹ کی خریداری کے وقت تمام تر کاغذی کاروائی انگریزی میں مبنی تھی اور وہ اپنی بیوی کے سامنے اس دفتر میں اپنی سبکی نہیں کروا سکتا تھا یہ کہہ کر کہ اسے انگریزی سمجھ نہیں آرہی۔ مجبوراََ اس نے خاموشی سے تمام تر کاغذات پہ سرسری سا دیکھ کر دستخط کر دئے، مگر اسکا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا جسے اس نے یہ سوچ کر جھٹک دیا کہ اتنا مشہور ادارہ ہے اتنے عرصے سے کام کر رہے ہیں یہ دھوکہ تھوڑی دیں گے ہمیں۔

مگر اب وہ اس رہائشی اسکیم کے دفتر سے موصول ہونے والے کاغذات کو دیکھ کر ششدر رہ چکا تھا کیونکہ اسکی انگریزی کی ٹوٹی پھوٹی استعداد اس کی مدد کرنے سے قاصر تھی مگر مندرجات میں درج پانچ لاکھ کی رقم اس کے حواس مختل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی کافی سوچ بچار کے بعد ہمت کر کے اس نے وہ کاغذات لئے اور اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر موجود وکیل صاحب کے گھر پہنچ گیا، ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا، یہ سب کرتے اس کی عزت نفس بہت مجروح ہو رہی تھی کیونکہ اسکے محلے والے اسے اب تک بہت پڑھا لکھا سمجھتے تھے مگر اب یہ بھرم ٹوٹنے والا تھا محض انگریزی نہ پڑھ سکنے پہ، وکیل صاحب نے سارے کاغذات بغور پڑھے اور ہاشم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"ہاشم بھائی! ان کاغذات کے مطابق آپ اس رہائشی اسکیم والوں کو ہر چھ ماہ بعد پانچ لاکھ روپے ادا کرنے کے پابند ہیں، اگر نہیں کریں گے تو آپکا بیانہ اور تمام جمع شدہ اقساط ضبط ہو جائیں گی، اور یہ بھی کہ ہر چھ ماہ کی ادائیگی والی رقم ادارہ اپنی مرضی سے کم اور زیادہ کر سکتا ہے۔"

بیچارہ ہاشم گم صم سا ہو گیا یہ سب سن کر،

"مگر دفتر والوں نے تو ایسا کوئی زکر اس وقت نہیں کیا تھا"

بدقت تمام وہ بولنے کے قابل ہوا

وکیل صاحب نے بے یقینی سے اسکی جانب دیکھا اور بولے

"آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہیں ہاشم بھائی، آپ نے فلیٹ کی خریداری کرتے وقت کاغذات کو پڑھا کیوں نہیں تھا؟؟ ان کے بولنے کے منتظر کیوں رہے؟؟"

"وہ اس وقت میں اپنی نظر کی عینک گھر بھول گیا تھا"

بھرم بچانے کے لئے اسے فی الوقت یہی بہانہ سوجھا۔

وکیل صاحب مطمئن ہوئے یا نہیں مگر انہوں نے بس اتنا ہی کہا کہ

"بہر حال یہ رقم تو آپ کو جمع کروانی ہی ہوگی، بصورت دیگر آپ اپنی جمع شدہ پچھلی ساری رقم سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے،

کیونکہ آپ نے جب ان سے فلیٹ خریدنے کا معاہدہ کیا تھا تب انکی تمام شرائط (جو کہ بہت پیچیدہ انگریزی متن میں تھیں) کو من و عن ماننے کا اقرار کیا تھا، نیچے آپ کے دستخط بھی موجود ہیں۔"

لڑکھڑاتے قدموں سے وکیل صاحب کے گھر سے نکلتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ پانچ لاکھ کی رقم کا بندوبست کیسے اور کیونکر کرے، نہ جمع کروانے کی صورت میں اسکی جمع شدہ تمام رقم جو کہ قریباً بیس لاکھ تھی اس سے ہاتھ دھونے کا

اندیشہ تھا، ایک غریب آدمی جس نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر اور عمر بھر کی جمع پونجی اکھٹا کر کے ایک چھوٹا سا فلیٹ قسطوں میں خریدنا چاہا تھا

مگر مفاد پرست اور بدنیت منافع خوروں کے ہاتھوں اسکی کمائی محض اس وجہ سے لٹنے جا رہی تھی کہ وہ انگریزی سے ناواقف تھا۔

وہ اپنا مقدمہ لیکر کہاں جاتا؟ ملک کے آئین کے مطابق اردو زبان کو بطور قومی و سرکاری زبان نافذ ہوئے پچاس سال ہو چکے تھے، مگر اس ملک کے تمام دفاتر پوری ڈھٹائی سے انگریزی زبان میں ہی کاروبار حیات چلا رہے تھے، ہر جگہ انگریزی رسم الخط میں لکھے احکامات جاری ہوتے، تمام تر دستاویزات کی زبان انگریزی تھی، تمام کاروباری معاہدے انگریزی زبان میں ہی کئے جاتے تمام شرائط و ضوابط بھی انگریزی میں ہی درج ہوتے اور بدقسمتی سے عوام کی اکثریت انگریزی زبان سے ناواقف ہے تب ہی وہ اپنے حقوق کے ضبط ہونے پہ احتجاج بھی نہیں کر سکتی کیونکہ ارباب اختیار کے کان صرف انگریزی زبان ہی سن سکتے قومی بولی ان کے کانوں سے پرے ہی گزرتی ہے اور نہ ہی وہ اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں۔

کیا یہ ناانصافی کی بدترین شکل نہیں کہ عوامی نوعیت کے کاروباری معاہدے بھی انگریزی زبان میں کئے جاتے ہیں

تاکہ ان پڑھ یا کم تعلیم یافتہ طبقے کا معاشی استحصال بآسانی کیا جاسکے کیونکہ معاہدے کی شرائط انگریزی میں ہونے کی وجہ سے عوام کی اکثریت لاعلمی میں بہت آرام سے ان کا شکار بن جاتی ہے، اگر یہی شرائط قومی زبان اردو میں درج ہوں تو عوام ان ظالمانہ شرائط کو کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنی محنت کی کمائی یوں لٹیروں کو لوٹنے دیں گے۔

افسوس انگریزی زبان کے ناجائز تسلط نے پورے پاکستان کو گونگا بنا دیا ہے۔